ہماری ویب ڈیجیٹل بک

# میر شاہد حسین

# MIR SHAHID HUSSAIN

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

## SOCIETY & CULTURE

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

*Collection of Published Articles*
*By "Mir Shahid Hussain"*
*at Hamariweb.com*

# اللہ آپ سے بھی پوچھے گا

کرنے والوں کیلئے سو راستے اور نہ کرنے والوں کیلئے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہم نے اپنی زندگی میں بارہا مشاہدہ کیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر بے حیائی پر مبنی مواد چلے تو کہا جاتا ہے کہ جس کو پسند نہیں وہ نہ دیکھے یا وہ ٹی وی بند کر دے، یا چینل تبدیل کر لے۔ لیکن اس کے برعکس جب کسی سیاسی جماعت کے لیڈر خطاب فرمائیں تو رویہ تبدیل ہو جاتا ہے اور ان کو یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ جس نے سننا ہے سنے اور جس نے نہیں سننا وہ اپنا چینل تبدیل کر لے۔

حال ہی میں سپریم کورٹ نے سودی نظام کے خلاف یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی کہ جو سود نہیں لینا چاہتے نہ لیں، لینے والوں کو اللہ پوچھے گا۔ میرا سوال ہے محترم جج صاحب سے کہ کیا اللہ آپ سے نہیں پوچھے گا کہ کلمہ توحید پڑھ کر آپ نے اللہ کا حلف اٹھایا تھا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان جس کے دستور کا آپ نے حلف اٹھایا تھا۔ کیا کسی غلط کام کرنے والے کو یہ کہہ کر اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ کرے اللہ اس سے پوچھے گا۔ تو پھر آپ نے شراب پر پابندی کیوں لگا رکھی ہے؟ یہ اس کا اپنا فعل ہے۔

حکومت الٰہیہ سے مراد وہ نظام حکومت ہے جس میں اللہ کی حاکمیت اور اس کے نازل کردہ احکام و قوانین کی فوقیت کو من و عن تسلیم کیا جائے۔ اور انھی کے مطابق ہدایات اور فروعی قوانین وضع کیے جائیں۔ جس مملکت کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہوگی اس کے لیے قانون کے لانے والے اور اس پر عمل کرکے دکھانے والے کے نقش قدم پر چلنا ناگزیر ہوگا۔

خلیفہ اللہ فی الارض" ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و" فرمانبرداری سے سرمو انحراف نہ کرے۔ آپ کے معاملات ہوں یا عبادات انھیں اسی طرح کر دکھائے جیسا کہ قانون کے لانے والے نے اپنی زندگی میں نمونہ کرکے دکھایا۔ عدل و انصاف کے صرف وہی اصول مملکت میں نافذ کرے جو اللہ کی طرف سے پہنچے ہوں۔ نیز زندگی کو ایسے ڈھب پر گامزن کرنے کی کوشش کرے جس کے ہر خط و خال سے آخرت کی جواب دہی کا تاثر پیدا ہو۔ اللہ کو "ملک الناس" جان کر دنیاوی زندگی کے تمام شعبوں میں قوانین الٰہیہ کی پابندی عملاً لازم کر دینا ہی حکومت الٰہیہ کے قیام کر دینے کے مترادف ہے۔ تکوینی حیثیت سے عملاً حکومت الٰہیہ قائم ہے۔ چاند، سورج، زمین، ملائکہ جن و انس سب وہی کچھ کرتے ہیں جو ان سب کا پیدا کرنے والا چاہتا ہے۔ فقط جن و انس ایسی مخلوق ہے جنھیں چند معاملات میں آزادء رائے بخشی گئی ہے۔ اور اسی

آزادء رائے کی بنا پر انسان اور جنات جزا و سزا کے مستحق گردانے گئے ہیں۔ چنانچہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب و مقام کو پہچان کر اس پر عمل پیرا ہونا ہی منشا الٰہی کو پورا کرنا ہے۔ اس کے برعکس آزاد منش ہونا۔ منشاء الٰہی کے خلاف اور حکومت الٰہیہ کے منافی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہت واضح طور پر سمجھادیا ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اطاعت ، فرمانبرداری کو اپنا شعار بنائے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ ترجمہ" ہم نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ ہماری اطاعت و فرمانبرداری کریں۔ جو ریاست حکومت الٰہیہ کی شرائط پوری کرتی ہے وہی اصل میں اسلامی ریاست کہلاتی ہے۔

سود سے متعلق احکامات قرآن پاک میں واضح درج کر دیئے گئے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اللہ سے جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے قبل کہ اللہ کا عذاب ہم سب پر نازل ہو۔ برائے کرم اپنے فیصلوں پر خود ہی غور فرمائیں ۔آپ نے اس سے قبل کئی اچھے فیصلے کیے ہیں۔ چاہے وہ سرکاری زبان اردو پر عمل کرنے کا فیصلہ ہو یا 62، 63 پر عمل کا فیصلہ .... آپ نے دستور کی ہر شق کی پاسداری کی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ دیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر آپ کو متوجہ کریں۔ کل جب روز محشر جب اللہ سب سے سوال کرے گا تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ یا اللہ ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق آگاہ کر دیا۔ جو

اہل اختیار ہیں اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ اس معاملہ کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ اللہ آپ
سے بھی پوچھے گا !!....

# خواب تو اچھے ہوتے ہیں

''کچھ سنا تم نے؟''

''نہیں! میں سنتا نہیں صرف دیکھتا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ اب ریڈیو کا زمانہ نہیں ٹی وی کا زمانہ ہے۔''

''ٹی وی کو دیکھتے ہو، سنتے نہیں ہو کیا؟''

''نہیں! سنتا ہوں لیکن دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوتی کہ جسے کان کے درمیان دماغ میں جگہ دی جاسکے۔''

''چیک کرواؤ..... مجھے تو ایسا لگتا ہے تمہارا دماغ ہی ختم ہوگیا ہے۔''

''نہیں دماغ نے کیا ختم ہونا ہے، بس چلنا چھوڑ دیا ہے اس نے۔''

''وہ کیوں؟''

''لوگ کہتے ہیں دماغ چل گیا ہے بڈھے کا! تبھی ایسی باتیں کرتا ہے۔''

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے!!''

''کیا مطلب ہے تمہارا!''

''دماغ کو چھوڑو یہ بتاؤ دن بھر کیا دیکھتے ہو؟''

''!!لڑائی مار کٹائی''

تم نے سنا نہیں میں تمہارے گھر کی بات نہیں کر رہا۔ ٹی وی پر کیا دیکھتے ہو یہ پوچھ رہا''

''ہوں۔

جو گھر میں چل رہا ہے وہی ٹی وی پر بھی چل رہا ہے۔ اب سمجھ نہیں آتا کہ ٹی وی''

''دیکھوں کہ گھر دیکھوں۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

جو ٹی وی پر دکھایا جائے گا وہی گھر میں بھی ہوگا۔ڈراموں میں بیٹیوں کو گھر سے'' بھاگنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ ساس سسر کو کس طرح مٹھی میں رکھنا ہے، شوہر کو کس طرح قابو میں رکھنا ہے، بہو سے کس طرح بات کرنی ہے۔ سبھی کچھ ان ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔ جس کو دیکھ کر کس گھر میں سکون آئے گا...... اور تو اور نیوز چینلز '' لگاؤ تو وہاں بھی ڈراموں میں کرائمز کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

''تو کیا یہ سب ہمارے معاشرے میں نہیں ہوتا جو ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے؟''

ہوتا ہوگا مجھے کیا پتا...... لیکن ہم نے کبھی گھر کے گندے کپڑے بیچ چوراہے پر نہیں'' دھوئے۔ جھگڑے کس گھر میں نہیں ہوتے لیکن اگر ان جھگڑوں میں محلے والوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کیا تمہارا خیال ہے کہ اس سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ کسی زمانے میں بڑے بوڑھے ان جھگڑوں کو بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن آج ہم نے ان کو گھروں سے یا تو نکال باہر کیا ہے یا ان کو وہ مقام ہی

" نہیں دیا کہ وہ آپ کے جھگڑوں کو دور کر سکیں۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

"! یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہی ہے"

تم ابھی کوئی بھی نیوز چینل لگا لو۔ کسی کے مرنے، رونے اور دھاڑنے کی بری خبریں" ہی ملیں گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے پورے ملک میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ کسی ایک کے

" ساتھ ہونے والی زیادتی کو آپ پورے ملک کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ تم نیوز نہ سنا کرو۔ سیاسی پروگرام دیکھا کرو..... وہ بھی کسی ڈرامے سے کم نہیں ہوتے"

"اور اس سے بھی کافی تفریح میسر آ جاتی ہے۔

رہنے دو ان سیاسی چکر بازیوں کو۔ الزامات اور برا بھلا کہنے کے علاوہ ہے ہی کیا ان" کے پاس.....!!"

" !! خواب"

خواب تو ہم بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں لیکن کبھی حقیقت کا روپ نہیں ملا انہیں۔ خواب" دیکھتے دیکھتے ہی تو قوم سو گئی ہے اور آج بھی دیکھ رہی ہے۔ نہیں دیکھنے ہم نے یہ خواب۔

"

"! خواب تو اچھے ہوتے ہیں"

لگتا ہے تم کمرشل ایڈ دیکھتے ہو، خواب بڑے خوبصورت دکھائے جاتے ہیں۔ جس میں" داغوں کو بھی اچھا کر دیا ہے۔ اگر اس ملک میں کچھ سستا ہوا ہے تو وہ یا تو انسان کا خون ہے یا پھر یہ موبائل کا نیٹ ورک۔ لوگوں کو ایسا باتوں میں

لگایا ہے کہ لوگ گھنٹوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑا ہے، پتا
"چلا بیگم میکے میں موبائل پر باتیں کر رہی ہیں۔
خواب تو امید ہوتے ہیں، اگر یہ بھی ختم ہو گئے تو پھر ہمارے پاس کیا بچے گا سوائے"
باتیں کرنے کے..... اور اگر یہ باتیں بھی ہم نہ کریں تو کیا کریں! بات چیت بھی جاری
رہنی چاہیے کیونکہ بات کرنے سے اکثر بات بن جاتی ہے ورنہ مایوسی بڑھتی ہے.....
"!اس لیے خواب اچھے نہیں بلکہ بہت اچھے ہوتے ہیں
کر لو باتیں..... پچاس سال سے باتیں ہی تو سن رہا ہوں لیکن یاد رکھو میں ایک کان"
سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہوں۔ ہاں دیکھتا ہوں..... صرف دیکھتا ہوں اور دیکھتا
.....ہی چلا جاتا ہوں

☆.....☆

# کوئی نہیں سنتا

"کیا بات ہے آج بہت خاموش ہو ! ! "

"تو کیا کروں؟.... کوئی سنتا جو نہیں ! "

"کون نہیں سنتا.... میں ہوں ناں"

"تمہیں سنانے کا کیا فائدہ .... جسے سننا چاہیے وہ تو سنتا نہیں۔"

"کسے سننا چاہیے .... کیا سننا چاہیے ، کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بوجھواتے رہو گے۔"

"صبح سے چیخ رہا ہوں کہ بیگم ایک کپ گرم چائے پلا دو مگر مجال ہے جو ان کے کانوں میں جوں تک بھی رینگی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں دیواروں سے باتیں کر رہا ہوں۔"

"بس اتنی سی بات.... "

"یہ تمہارے لیے اتنی سی بات ہو گی لیکن میرے لیے تو ناک کا مسئلہ ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

"خود اٹھ کر بنا لی ہوتی۔ بھلا چائے بنانا بھی کوئی مشکل کام ہے۔"

"جب بیگم گھر پر ہے تو میں چائے کیوں بناؤ۔ یہ اس کا کام ہے۔ جو میرا کام ہے وہ میں کرتا ہوں، وہ نہیں کرتی۔ تو پھر میں کیوں اس کا کام کروں۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اس طرح تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

"مسئلہ میں نے نہیں پیدا کیا۔ یہ اس کا پیدا کردہ ہے۔ اسے میری بات سننا چاہیے۔"
" وہ آپ کی بات نہیں سن سکتیں۔"
"وہ کیوں؟"
"اس لیے کہ ان کے کانوں پر تو موبائل کے ہینڈ فری لگے ہوئے ہیں۔ وہ دوسری کال پر مصروف ہیں، برائے کرم انتظار کیجیے۔"
" نہیں ہوتا مجھ سے اتنا انتظار۔"
"تو پھر خود ہی چائے بنا لو۔"
"وہ بھی نہیں ہوتا۔"
"تو پھر تم سے ہوتا کیا ہے؟"
"اب تم میرا منہ نہ کھلواؤ۔ کوئی کام نہیں ہے جو میرا سر کھانے آ جاتے ہو۔"
"کام سے یاد آیا میں تو تمہارے پاس اس لیے آیا تھا کہ باہر گلی میں سیوریج کا پانی جمع ہو رہا ہے، چل کر محکمہ والوں کو رپورٹ کرتے ہیں۔"
"کیا ہمارا گٹر بہہ رہا ہے؟"
" !! نہیں"
"تو پھر ہم کیوں جائیں۔"
"لیکن گندا پانی تو ہمارے دروازے تک آ رہا ہے۔ اس کا کیا کریں؟"
"کرنا کیا ہے مٹی ڈال کر راستہ دوسری طرف موڑ دو۔"

"لیکن مچھر تو جمع ہوگا اس گندے پانی میں۔"

" اب کیا ہم نے گلی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا لیکن کسی کو تو آگے آنا ہوگا ورنہ یہ گندا پانی اسی طرح بہتا رہے" گا اور ماحول کو خراب کرتا رہے گا اور بیماریاں بھی پھیلائے گا۔ ہو سکتا ہے گلی کا کوئی بچہ "بھی اس میں گر جائے۔

"کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکلنا۔ بس واہیات ہی بولنا۔"

" تو پھر کیا ارادے ہیں؟"

کہا ناں مٹی ڈالو اس مسئلہ پر۔ واٹر اینڈ سیوریج بورڈ والے نہیں سنتے کسی کی۔ وہ کسی" اور ہی کام میں مصروف ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ گٹر کا پانی پورے شہر میں یوں جگہ جگہ "سے ابل نہ رہا ہوتا۔ یہ مسئلہ صرف ہماری گلی کا نہیں پورے شہر کا یہی حال ہے۔

"تو پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟"

"مسئلہ میرا یا تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ بس جس کا کام ہے اسے کرنا چاہیے۔"

"اگر ہم اپنی مدد آپ کے تحت کچھ کریں تو شاید یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

"اس مسئلہ کو تم یہی رہنے دو اور جا کر میرے لیے گرم گرم چائے بنا دو۔"

" لیکن وہ تو تمہاری بیگم بنائیں گی۔"

نہیں بنائیں گی.... مجھے پتا ہے .... کوئی نہیں سنتا یہاں پر.... کوئی نہیں سنتا !" "اسی لیے میں خاموش ہوں۔

☆....☆

# گدھوں کا انتخاب

"یہ باہر شور کیسا ہے؟"

"الیکشن ہو رہے ہیں...."

"کیا الیکشن ہی ہوتے رہیں گے یا پھر کچھ کام بھی ہوگا۔"

"الیکشن بھی تو ایک کام ہے، جس سے کئی ایک کے کام بنتے ہیں۔ اب اسی بات کو دیکھ لو کہ بلدیاتی الیکشن ہوں گے تو کئی ایک کو روزگار مل جائے گا۔"

"اب اسی طرح بے روزگاری دور کرنا ہے تو عوام کو کیوں پریشان کرتے ہیں؟"

"تمہیں کس نے کہا کہ عوام پریشان ہے؟ عوام تو بہت خوش ہے الیکشن سے.... جس سے وہ پانچ سال میں صرف ایک بار ملتے تھے وہ اب بار بار ان کے دروازے پر ووٹ کی بھیک مانگنے آ رہا ہے۔"

"ویسے تمہارے خیال سے اس طرح ملک میں کوئی تبدیلی آئے گی؟"

"یہ تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے کہ جمہوری حکومت میں بلدیاتی الیکشن ہو رہے ہیں۔"

"لیکن یہ تو سپریم کورٹ کے حکم پر مجبوراً ہو رہے ہیں۔ ورنہ یہ جمہوری لوگ تو اپنی پارٹی میں بھی الیکشن نہیں کرواتے۔"

"یہ بات درست نہیں.... دو جماعتیں ایسی ہیں جنہوں نے اپنی پارٹی میں الیکشن کروائے ہیں۔"

"تمہارا اشارہ تحریک انصاف اور جماعت اسلامی کی طرف ہے۔ "

"اگر انصاف کی بات کروں تو یہی سچ ہے۔ "

تم انصاف کی بات نہ کرو، ورنہ مجھے لگتا ہے کہ تم تحریک انصاف کی بات کر رہے ہو یا"
پھر اس کے اتحادی کی جو انصاف کا ترازو لے کر سپریم کورٹ کے باہر اسے تلاش کر رہی
" ہے اور اسے پتا نہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔

"یہ تو تم نے حق اور سچ کی بات کی۔"

میری کیا مجال کہ میں حق کی بات کرو، حق کی بات صرف حق پرست ہی کر سکتے ہیں۔"
".... دوسروں کو حق بات کہنے کی اجازت نہیں چاہے وہ حقیقی ہو یا کوئی اور

"تمہاری بات میں وزن ہے۔"

میری بات میں وزن کہاں ؟ وزن تو پیپلز پارٹی کے پاس ہے، جب ہی تو ان کی پارٹی"
"کے لوگ کہتے ہیں کہ ایک زرداری سب پہ بھاری۔

"اسی لیے آج کل ان کی پارٹی ان ہی کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔"

" بہت پارٹی کر لی ....اب یہ پارٹی کا نہیں لیگ کا زمانہ ہے۔"

صحیح کہا تم نے .... اسی لیے کرکٹ ،فٹ بال اور دیگر کھیلوں میں لیگ میچز ہو رہے "
"ہیں۔

"میں کھیل کی نہیں سیاست کی بات کر رہا ہوں۔ "

"!! ایک ہی بات ہے۔ کھیل میں سیاست اور سیاست میں کھیل "

"ویسے یہ کھیل اور سیاست کو الگ الگ ہونا چاہیے۔"

"الگ الگ ہی تو ہے .... اسی لیے الگ الگ میچز ہوتے ہیں۔"
"کھیل اور سیاست الگ الگ ہوتے تو آج بھارت میں ہمارے منہ پر کالک نہ مل دی جاتی۔"
"منہ کالا کرکے بھی ہم نے کیا سیکھا ہے؟"
"سیکھا تو بہت کچھ ہے اسی لیے عوام نظام میں تبدیلی چاہتی ہے .... چہرے کی تبدیلی نہیں۔"
".... اس کا مطلب طاہر القادری کا انقلاب"
"اب تو طاہر القادری کا انقلاب بھی الیکشن میں حصہ لے رہا ہے.... ورنہ وہ کچھ عرصہ قبل نظام کو ہی گرانے کی بات کرتے دکھائی دے رہے تھے۔"
"نظام کو صرف نظام الدین ہی تبدیل کرسکتا ہے اور لیکن اس کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے۔"
"یہ نظام الدین کون ہے؟"
"ارے اپنا نظام .... سارے سیاستدان اس سے ہی سبق لیتے ہیں۔ جس نے نظام کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ جہاں نظام خراب ہوا اس کو ہی یاد کیا جاتا ہے۔"
"اسی لیے سالہا سال سے وہی پرانے چہرے جمہوریت کی پہچان بنے ہوئے ہیں۔"
"پاکستان کی عوام کسی نئے چہرے پر اتنی جلدی بھروسہ نہیں کرتی۔"
"جن پر بھروسہ کیا تھا انہوں نے ہمیں گدھے کا گوشت کھلا دیا۔"
"آپ کو کس گدھے نے گدھے کا گوشت کھانے پر مجبور کیا تھا؟؟.... آپ نے اپنی

"مرضی سے کھایا ہے۔

"لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ گدھے کا گوشت ہے۔ "

اب رہنے دو میرا منھ نہ کھلواؤ.... جب ان لوگوں کو ووٹ دیتے ہو تو تمہیں پتا نہیں "

"ہوتا کہ کسے ووٹ دے رہے ہو؟

"گدھے کا گوشت کھا کر اب ہم گدھوں کو ہی منتخب کریں گے۔ پھر شور کیسا؟"

☆....☆

"کچھ محسوس کیا آپ نے؟"

" نہیں!! کیوں کیا ہوا؟"

"ابھی ابھی کچھ چکر سے آئے ہیں....ایسا لگا جیسے زلزلہ آیا ہے۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوا.... تمہارا وہم ہوگا۔"

"تم میری ہر بات کو وہم کا نام کیوں دے دیتے ہو؟"

" اس لیے کہ تمہیں ہر بات میں کچھ نہ کچھ محسوس ہونے لگتا ہے۔"

" محسوس کرنا کیا کوئی بری بات ہے؟"

" نہیں بری بات آپ کے لیے نہیں ہمارے لیے ہے۔"

"آپ جو بھی محسوس کرتے ہیں، آپ کی بلا سے .... کرتے رہیں.... ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

" وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ الٹی سیدھی خبریں پتا نہیں کہاں سے سن کر آجاتے ہو اور پھر مجھے سناتے ہو۔ اب تم کچھ بھی کہو مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں۔"

" میری بات کا یقین کرو.... ابھی ابھی زلزلہ آیا تھا۔"

" آیا ہوگا.... مجھے کیا؟"

"میں زلزلہ کی بات کر رہا ہوں، حکومت کے آنے جانے کی نہیں۔"
"کیا فرق پڑتا ہے .... روز روز مرنے سے بہتر ہے ایک روز ہی مر جائیں۔"
"یار اتنی بے حسی اور ناامیدی اچھی نہیں ہوتی۔"
"کس نے کہا کہ ناامید ہیں.... روز کسی نہ کسی سانحہ یا حادثات سے گزرتے ہیں اور اپنوں کی لاشیں اٹھاتے ہیں، غیرت مند والدین اپنی بہو بیٹیوں کی غیرت کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور پھر اسی طرح روزمرہ کی طرح چلنے لگتے ہیں۔ اب اگر زلزلے نہ آئیں تو کیا من و سلویٰ اترے گا۔"
"ٹی وی لگاؤ، ضرور وہاں کوئی بریکنگ نیوز چل رہی ہو گی"
"یہ بریکنگ نیوز سن سن کر ہی تو ہم بریک ہو گئے ہیں.... کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ روز شیر آتا ہے اور کسی نہ کسی کو موت کے منہ میں لے جاتا ہے اور ہم لوگ بے حسی کی تصویر بنے اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔"
"میڈیا کا کام خبر دینا ہے اور اگر وہ خبر نہیں دے گا تو کیا کرے گا؟"
"خبر ضرور دے لیکن ہر خبر کو بریک نہ کرے .... ورنہ خبریں بریک ہو ہو کر ہمارے دل و دماغ کو بریک کر دیں گی۔ دن میں ایک بار کہو کہ شیر آگیا تو میں یقین کروں گا لیکن اگر تم صبح دوپہر شام شیر آگیا کا شور مچاؤ گے تو پھر تمہاری بات پر کون یقین کرے گا!!"
"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن زلزلہ کون سا روز روز آتا ہے.... تمہیں میری بات کا یقین کرنا چاہیے۔"

"میں یقین کر بھی لوں تو کیا فرق پڑتا ہے.... اپنی بات کا یقین عوام کو دلاؤ۔ "
عوام کو یقین دلانا بہت مشکل ہے.... ان سے اتنی بار تبدیلی ،انقلاب اور روٹی کپڑا "
اور مکان کے نام پر دھوکا دیا گیا ہے کہ اب وہ کسی کی بات پر بھروسہ کرنے کے لیے
"تیار نہیں۔
"پھر حکومت کو اپنی بات کا یقین دلا دو۔ "
وہ تو اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔کچھ بھولی اور سادہ عوام تو پھر بھی ہماری بات "
"پر یقین کرلے لیکن حکومت تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
"ایک طریقہ ہے ان کو یقین دلانے کا"
"اور وہ کیا؟"
"بس.بریکنگ نیوز چلانا پڑے گی۔پھر دیکھو وہ کس طرح نوٹس لیتے ہیں۔"
"لیکن میں.بریکنگ نیوز کے سخت خلاف ہوں۔ "
تو پھر محسوس کرتے رہو زلزلے کے جھٹکے.... کوئی یقین نہیں کرے گا تمہاری بات کا "
"....

☆....☆

# زلزلے کے بعد تبدیلی

''یہ آج اتنی خاموشی کیوں ہے؟جب زلزلہ آیا تھا تو بہت شور تھا۔یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟''

''تم پتا نہیں کس طوفان کی بات کر رہے ہو..... یہاں تو زلزلہ بھی آگیا اور طوفان بھی.....!!''

''کون سا طوفان آگیا؟''

''تمہیں پتا نہیں ریحام خان کو طلاق ہو گئی۔''

''تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ کپتان کا ذاتی فیصلہ ہے.....''

''بے شک یہ ان کا ذاتی فیصلہ ہے لیکن ان کی ذات کے ساتھ تبدیلی والے بھی جڑے ہوئے ہیں۔''

''اسی لیے تو تبدیلی آنہیں رہی بلکہ آ گئی ہے۔''

''ویسے یہ دوسری تبدیلی ہے۔''

''تبدیلی تو تبدیلی ہوتی ہے پہلی ہو یا دوسری.....''

''تو پھر کیا اب تبدیلی کی ہیٹ ٹرک کا پروگرام ہے.....''

''پتا نہیں..... یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کی نجی زندگی پر نکتہ چینی کرے۔''

''ٹھیک کہا تم نے لیکن ہم نکتہ دان نکتہ چینی نہ کریں تو کیا کریں۔''

"اب کیا ہوگا؟"
کچھ نہیں کہہ سکتے..... زلزلے آتے ہیں تو کہتے ہیں زمین میں تبدیلی آجاتی ہے۔ کہیں"
کوئی چھپا ہوا جزیرہ دریافت ہوجاتا ہے اور کہیں کوئی جزیرہ سمندر میں غائب ہوجاتا
ہے۔"
"زلزلہ کے جھٹکے محسوس تو ہوئے تھے لیکن اس تبدیلی کی امید نہیں تھی۔"
"اس بڑے زلزلہ کے بعد آفٹر شاکس کا سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہے گا۔"
تبدیلی کے اس عمل میں یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔ کئی بڑے نام اس تبدیلی کا شکار"
"بن کر زیر زمین جا چکے ہیں اور مزید کچھ جزیرے منظر عام پر آنے کو بے تاب ہیں۔
تبدیلی کے اس عمل میں کئی لوگ بے گھر ہوگئے اور کئی ایک اس دنیا سے چلے گئے"
"۔لیکن مجھے منظر میں کوئی تبدیلی ہوتی نظر نہیں آتی۔
منظر میں تبدیلی جب آئے گی جب ہم اپنے پس منظر کو تبدیل کریں گے اور پس منظر"
"میں ایسی قوتیں ہیں جو الیکشن لڑتی نہیں بلکہ لڑواتی ہیں۔
"اب تم زلزلہ پر سیاست کررہے ہو۔ میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا۔"
تمہیں کس نے یہ کہا کہ کوئی اجازت لے کر سیاست کرتا ہے۔ سیاست کرنے کے لیے"
"ایشو چاہیے اور یہ بہت بڑا ایشو ہے۔
"تمہیں زیب نہیں دیتا کہ تم اب مزید اس پر کوئی بات کرو۔"
میں نے جو کچھ زیب تن کر رکھا ہے اس میں مجھے ہر چیز کی اجازت ہے جس کے"

چاہوں کپڑے اتاروں اور جس کو چاہوں کپڑوں کی چادر میں لپیٹ دوں۔ میں کسی کو
"جواب دہ نہیں۔
"ایسا نہ کرو یہ مکافات عمل ہے ..... کل کو تمہیں بھی اس سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔"
"!! یہ سیاست ہے پیارے..... اس میں سب چلتا ہے"
"!! .....اسی لیے تو میں خاموش تھا ..... خاموش ہوں اور اب خاموش ہی رہوں گا"

☆.....☆

# راؤنڈ ون

'' یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''بلدیاتی انتخاب ہو رہے ہیں۔''

'' لگتا ہے تو ایسے ہے جیسے فری اسٹائل ریسلنگ ہو رہی ہو۔''

'' یہ تو ابھی انتخاب کا پہلا راؤنڈ ہے..... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟''

''اگر ہم میں برداشت نہیں ہے تو پھر ہم انتخابات کرواتے کیوں ہیں؟''

'' اس لیے تاکہ ہم میں برداشت پیدا کیا جاسکے۔''

'' برداشت کیااس طرح پیدا کیا جاتا ہے ! ! لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تمہارے انتخاب کے چکر میں۔''

'' آپ نے سنا نہیں ، کہتے ہیں ہمت ہے تو کراس کر، ورنہ بیٹا برداشت کر!''

'' برداشت نہیں ہوتا یہ سب کچھ دیکھ کر..... ''

''برداشت کرلو تو اس میں تمہاری بہتری ہے..... ورنہ نتائج تمہارے سامنے ہیں!''

'' واقعی انتخاب کے نتائج بہت بھیانک ہیں..... بلکہ بہت سنگین ہیں ! !''

''انتخابات آزادانہ ماحول میں ہوئے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

'' آزاد امیدواروں کا اتنی بڑی تعداد میں جیتنا اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔''

''میں تو کہتا ہوں آزاد امیدواروں کو بھی اپنی ایک پارٹی بنانا چاہیے جس کا

”نام ہو آزاد پارٹی۔
”آئیڈیا برا نہیں..... پارٹیاں تو بہت ہیں لیکن آزاد کوئی نظر نہیں آتی۔ ”
”مجھے لگتا ہے دھاندلی ہوئی ہے۔“
”وہ کیسے؟ ”
”تم دیکھ نہیں رہے کہ پی ٹی آئی کے بہت کم امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ ”
”تو اس سے کیا ہوتا ہے؟“
”اس سے پتا چلتا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ ”
”دھاندلی کو ثابت کرنا پڑے گا۔ ”
”وہ کیا مشکل کام ہے صرف دھرنا دینا ہوگا اور دھاندلی ثابت ہو جائے گی۔ ”
”اب دھرنوں کا وقت گزر گیا..... تبدیلی ووٹ سے آئے گی دھرنوں سے نہیں۔“
”ووٹ سے تبدیلی نہیں آ رہی اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ دھرنا دینا ہوگا۔ ”
اپنی باری کا انتظار کرو، وہ کہتے ہیں ناں کہ ضد نہ کر اساں آپ بڑے ضدی آں (ہم ”
”خود بہت ضدی ہیں)۔
”اس میں ضد کی نہیں اصول کی بات ہے، انصاف کی بات ہے۔ ”
انصاف کی بات ہے تو عدالت میں کرو اور اگر اصول کی بات ہے تو الیکشن کمیشن میں ”
”کرو۔
”اس طرح تو پورے پانچ سال مکمل لگ جائیں گے۔ ”
”تو پھر انتظار کرو۔ ”

"ہم انتظار نہیں کر سکتے۔"

انتظار تو آپ کو کرنا پڑے گا، چاہے وہ بجلی آنے کا ہو، گیس آنے کا ہو، مہنگائی جانے کا"
"ہو یا پانی آنے کا۔

پچاس سال ہو گئے انتظار کرتے ہوئے اب مزید انتظار نہیں ہوتا۔ مر جائیں گے تو کیا"
"انصاف کروگے۔

نہیں مرنے دیں گے آپ کو، فکر نہ کریں۔ آپ ہوں نہ ہوں لیکن ہم آپ کا نام "
"ووٹر لسٹ میں کم از کم ضرور زندہ رکھیں گے۔

".....ہم نہ ہوں ہمارے بعد"

"!انتخاب .....انتخاب"

".....جب تک سورج چاند رہے گا"

"!!ووٹر تیرا نام رہے گا"

چلو یار ہم بھی تیاری کرتے ہیں اگلے راؤنڈ کی..... ہو سکتا ہے اس بار ہمارا بھی نام نکل"
"آئے۔

سوچ لو..... انتخاب کے نتائج آپ کے سامنے ہیں!! پتا ہے ناں پھر کیا ہوگا اگلے راؤنڈ"
"!!میں

☆.....☆

# ڈولی کی بولی اور ڈھولی

"کیا آپ کو چینی آتی ہے؟"

"گھر میں خود تو نہیں آتی بازار لینے اکثر جانا پڑتا ہے!"

"میں کھانے والی چینی کی نہیں بولے جانے والی چینی کی بات کر رہا ہوں۔"

" چین ہمارا دوست ہے اور دوستی زبان سے نہیں دل سے کی جاتی ہے۔"

" سیدھا سیدھا کہو نہیں آتی۔"

"آتی ہے تب ہی تو چینی ڈولی پاکستان آئی ہے۔"

" ڈولی کو بھولی بنایا گیا ہے۔"

"بنایا نہیں گیا وہ چین سے بنی بنائی آئی ہے۔"

" کیا مطلب ہے تمہارا.... کیا چین نے ڈولی کی ایکسپورٹ بھی شروع کر دی ہے؟"

" پتا نہیں اسے برآمد کیا گیا ہے کہ درآمد کیا گیا ہے لیکن بہر حال پاکستان کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

"اب کیا کر سکتے ہیں؟"

"اسی لیے پوچھا تھا کہ ڈولی کی بولی آتی ہے؟"

'چینی کو سمجھنا تو مشکل ہے ہی لیکن ڈولی کی بولی سمجھنا تو بہت مشکل ہے، اسی لیے اب تک اسے کوئی سمجھا نہیں پایا"

" تو اب اسے کون سمجھائے گا؟"

محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی، کوئی عمر نہیں ہوتی، کوئی حدود اربعہ یا جغرافیہ نہیں "
"ہوتا۔
یہ سب ڈراموں میں اچھا لگتا ہے لیکن حقیقت کی زندگی ڈراموں سے ذرا مختلف ہوتی "
"ہے۔
"آپ کو یہ سب ڈرامہ لگتا ہے؟ "
"ڈرامہ تو نہیں لگتا لیکن میڈیا والوں نے اسے ڈرامہ بنا دیا ہے۔"
"اب اس ڈرامہ کا ڈراپ سین کیا ہوگا؟ "
یہ تو اگلی قسط میں ہی پتا چلے گا۔ لیکن ڈرامائی موڑ اس کہانی میں اس وقت آیا ہے جب "
ملتان کے نوجوان نے اس ڈرامے میں انٹری ڈالتے ہوئے ایک نئی صورتحال پیدا کر دی
"ہے۔ وہ ڈولی کی ڈھولی ڈھول کی تھاپ پر اپنے کندھوں پر اٹھانا چاہتا ہے۔
سارے ہیرو ہی کہانی میں ہیں کوئی ولن بھی آئے گا اور یہ کہے گا کہ یہ شادی نہیں"
"ہو سکتی۔
اب یہ شادی ہو یا نہ ہو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن پاک چین دوستی کو یہ خبر"
"چلا کر ضرور داغ دار کیا گیا ہے۔
پاک چین دوستی اتنی کمزور نہیں کہ اس داغ سے داغ دار ہو جائے۔ یہ کوہ ہمالیہ کی "
"پہاڑیوں سے بلند ہے۔
یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم نے اسے کوہ ہمالیہ کی پہاڑیوں سے ناپتے ہیں جس میں "

"آئے روز زلزلے آتے رہتے ہیں۔

"کیا یہ زلزلہ ہے؟ "

زلزلہ تو آیا ہے لیکن اس کی گہرائی بہت زیادہ ہے، اس لیے اکثر کو محسوس نہیں ہوا "

"اور جس کو محسوس ہوا ہے اسے دڑاریں نظر نہیں آ رہیں ہیں۔

"جب دڑاریں نہیں پڑیں تو آپ کیوں ڈراریں ڈالنے پر تل گئے ہیں۔ "

ہمارا کام ہی ڈراریں تلاش کرنا ہے۔ ورنہ لاہور کی فیکٹری حادثہ کی صورت میں یہ "

"کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی ہے۔

"حادثات سے ہم کچھ نہیں سیکھتے اسی لیے تو یہ ڈراریں پڑتی ہیں۔ "

حادثہ کے بعد نوٹس اور نوٹ جاری کر دیے جاتے ہیں اور پھر کسی اگلے حادثہ کا انتظار "

"کرتے ہیں تاکہ بریکنگ نیوز چلے اور ہماری خبر کے ساتھ نوٹس اور نوٹ بھی چلیں۔

"بدنام گر ہوئے تو کیا نام نہ ہوگا کہ مصداق بدنامی ہم نے مستعار لے لی ہے۔ "

"کس سے مستعار لی ہے؟"

"جس سے مستعار لی ہے اب اسی سے دوا بھی لینی ہوگی۔ "

"آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ "

"ڈولی کی بولی اور ڈھولی۔ "

☆....☆

# غصہ کیجیے

اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ اسے بالکل غصہ نہیں آتا تو میں اس کی بات پر ہر گز یقین نہیں کروں گا کیونکہ غصہ ایک فطری عمل ہے اور ایک بات جو میں اکثر دوستوں سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اچھا یا برا ہوتا ہے۔ قدرت نے کوئی بھی چیز بیکار پیدا نہیں کی ہے۔ غصہ آپ کی طاقت ہے اسے بیکار ضائع نہ کریں بلکہ اس کا اچھا استعمال کریں۔

غصہ کی طاقت کو استعمال کرنے کیلئے سب سے پہلے آپ کو غصہ پر قابو پانا ہوگا جبھی آپ غصہ پر سواری کر سکیں گے۔ غصہ پر قابو پانے کیلئے آپ نے اس سے قبل بے شمار مضامین پڑھے ہوں گے۔ میں یہاں صرف دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھوں گا۔ سب سے پہلے تو جب کسی بات پر غصہ آئے تو خاموشی اختیار کریں۔ ممکن ہو سکے تو پانی پی لیں کیونکہ غصہ سے انسان کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور پانی آگ کی طرح آپ کو بھی ٹھنڈا کر دے گا لیکن یاد رہے کہ ہم نے اس آگ کو استعمال کرنا ہے۔ اس لیے اسے مکمل طور پر ٹھنڈا نہیں ہونے دینا بلکہ اس کی راکھ میں سے چنگاریوں کو زندہ رکھنا ہے تاکہ بوقت ضرورت اپنی مرضی کے مطابق آگ کو استعمال کر سکیں۔ بھڑکتی ہوئی آگ کبھی بھی فائدہ

نہیں دے سکتی جب تک ہم آگ کو قابو میں رکھ کر استعمال نہ کریں۔

اسلام میں ہمیں اس کی کئی بہترین مثالیں مل سکتی ہیں۔ یہاں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ساتھ حج کی نیت سے مکہ مکرمہ کا رخ کرتے ہیں لیکن انہیں حج کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک صلح حدیبیہ طے پاتا ہے جو کفار کی شرائط کے مطابق تھا۔ صحابہ کرامؓ کو اس بات پر بے انتہا غصہ آتا ہے کہ ہم کفار سے دب کر کیوں معاہدہ کریں۔ لیکن چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا اس لیے خاموش رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غصہ کو قابو پا کر واپسی کا حکم دیتے ہیں۔ لیکن واپس جا کر جب دوبارہ لوٹتے ہیں تو فتح مکہ حاصل کرتے ہیں۔

میں نے اکثر کمزوروں کو غصہ کے وقت اپنے سے کئی گنا طاقتور کو زیر کرتے دیکھا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کا انجام کیا ہوتا ہے وہ آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنی غصہ کی طاقت کو فوراً استعمال کرکے ضائع نہ کریں بلکہ غصہ پر قابو پا کر اسے بن جاتا ہے۔ اگر یہ ضد اور (Ego) استعمال کریں۔ غصہ کو دبا دیا جائے تو وہ ضد اور انا انا کسی مثبت اور تعمیری کام کیلئے استعمال ہو تو اچھی ہوتی ہے لیکن اگر اس ضد اور انا کو تخریبی کام کیلئے

استعمال کیا جانے لگے تو بری بن جاتی ہے۔ جس طرح لالچ بحیثیت خود ایک بری چیز ہے لیکن اگر علم کے راستے میں ہو تو انسان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اور وہ علم کا سمندر بن جاتا ہے۔ انسان کسی چیز پر قناعت نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ چاند تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن اگر یہی ہوس خونی بن جائے تو انسان کو جانور سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔

ہمارے ایک دوست جنہیں میں اپنا استاد بھی سمجھتا ہوں کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے لیکن اگر یہی صبر زیادہ ہو جائے تو پھل گل سڑ جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے یوں پیش کروں گا کہ جاپان پر امریکہ نے دو ایٹم بم گرائے اور جس کے نتیجہ میں جاپانی قوم کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ جاپانی قوم نے صبر سے کام لیا اور اسی غصہ کو اپنی قوم میں پروان چڑھایا اور آج جاپانی قوم ترقی کی بلندی کو چھو رہی ہے لیکن وہی بات کہ صبر زیادہ ہو جائے تو گل سڑ جاتا ہے۔ یہی بات جاپانی قوم پر صادق آتی ہے۔ انہوں نے ترقی تو حاصل کر لی لیکن آج جاپانی قوم میں آپ کو امریکہ کے خلاف وہ نفرت ہرگز نہیں ملے گی جو ان کی پچھلی نسلوں میں تھی۔ آج جاپانی قوم امریکہ کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔

فلسطین اور اسرائیلی طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن اس کے باوجود فلسطینی

پتھر کے ساتھ ٹینکوں کا مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے جواب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو شاید ان میں یہ چنگاری بھی بجھ جائے تو آگ بن سکتی ہے۔ یہ ان کی جدوجہد آزادی کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور تاریخ میں قوموں پر عروج و زوال آتے ہی رہتے ہیں لیکن زندہ وہی رہتا ہے جس میں کچھ تحریک پائی جائے۔

میرے نزدیک جس میں غصہ نہیں اس میں غیرت نہیں۔ آپ کے وطن پر دشمن قوم حملہ کرے اور آپ کو غصہ نہ آئے..... آپ کے والدین کو کوئی گالی دے اور آپ کو غصہ نہ آئے..... کوئی آپ کے دین پر کیچڑ اچھالے اور آپ کو غصہ نہ آئے۔ غصہ تو آئے گا لیکن اسے پروان چڑھا کر اپنی طاقت میں اتنا اضافہ کریں کہ دشمن کو پھر کبھی ایسی جرات نہ ہوسکے۔ یاد رکھیں کہ جسمانی طاقت سے آپ کسی کو زیر کر سکتے ہیں لیکن اس کے غصہ کی طاقت کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیشہ دشمن کے دل کو فتح کرنے کی کوشش کریں۔ دل کے فتح ہوتے ہی دشمن خود بخود ختم ہو جائے گا۔ جس کی ایک بہترین مثال مکہ کی فتح ہے جس میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں بہا اور آپ نے دشمن کو زیر کر لیا۔ آیئے ہم بھی اپنے غصہ کو استعمال کرکے آج سے کسی دشمن کے دل کو زیر کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ دشمنی ختم ہو گئی تو دشمن خود بخود ختم ہو جائے گا۔

# اُمید کی کرن

گپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ایسے میں کسی نے ماچس کی ایک تیلی کو روشن کیا تو گھٹا ٹوپ اندھیرے کو روشنی کی ایک کرن نے چیر کر رکھ دیا اور راستہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے سوچا اگر روشنی کی ایک کرن چار سو پھیلے ہوئے اندھیرا کا سینہ چاک کر سکتی ہے تو پھر ہم مایوسی کے اندھیروں میں کیوں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کیوں ہمیں امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن ہمیں مایوسی کے اندھیرے میں دھکیل کر ختم کر دینا چاہتا ہے۔

امید ایسی روشنی ہے جو مرتے ہوئے انسان کو بھی زندگی دے سکتی ہے اور مایوسی ایک ایسا اندھیرا ہے جو زندگی کو موت کی طرف لے جاتا ہے۔ اپنے بچپن میں انگریزی کی نصابی کتاب میں ایک واقعہ پڑھا تھا جو آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ایک مچھیرا اپنے بیٹے کے ساتھ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے گیا۔ لیکن سمندر میں طوفان آگیا اور ان کی کشتی ڈوبنے لگی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کشتی کو بچانے کی لیکن وہ ایسا نہ کرسکے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اور اس کا بیٹا سمندر کی موجوں میں بہنے لگے۔ مچھیرا سوچ رہا تھا کہ اب اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اس لیے کہ وہ زیادہ دیر تک ان موجوں کا مقابلہ

نہیں کرسکے گا۔ یہ سوچتے ہی اس کی ہمت جواب دینے لگی۔اچانک ڈوبتے ہوئے اسے اپنے بیٹے کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ اگر وہ ڈوب گیا تو اسے کون بچائے گا؟ ..... یہ سوچنا تھا کہ اس میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی اور اس میں ایک ایسا حوصلہ پیدا ہوا جو سمندر کے طوفان کو مات دے سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش اور جدوجہد سے اس نے قریب سے گزرتے ایک تختہ کو پکڑ لیا۔اب اسے اپنی نہیں بیٹے کی فکر تھی اور وہ اسے آس پاس تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی اسے ڈوبتا ہوا نظر آگیا اور اس نے اسے تھام لیا اور یوں وہ اس طوفان میں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے موت کی لہروں کا مقابلہ کرکے زندگی کی جنگ جیت گئے اور بخیریت ساحل تک پہنچ گئے۔

بحیثیت قوم ہماری کشتی بھی ایسے ہی ایک طوفان میں گری ہوئی ہے اور امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ اپنی ذات سے اٹھ کر سوچنے کی اور خود کو مایوسی کے چنگل سے آزاد کرنے کی کہ اگر ہم مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب گئے تو قوم کو روشنی کون دے گا؟ ہمیں امید کی شمع کو روشن کرنا ہے کہ روشنی تھوڑی بھی ہو تو اندھیرے کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

سڑک پر ٹریفک تیزی سے رواں دواں تھا۔ ایسے میں کوئی سنگل کو خاطر میں لانے کو تیار نہ تھا لیکن میں نے یہ سوچا کہ کوئی سگنل پر رکے نہ رکے میں رکوں

گا اور یہ سوچنا تھا کہ میں ایک سنگل پر ٹھہر گیا۔ پیچھے سے آنے والی ٹریفک نے مجھے رکا دیکھا تو انہوں نے بھی اپنی گاڑیوں کو بریک لگائی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بھیڑ چال چلنے کے عادی ہیں۔ اگر ایک بھیڑ اپنے شعور سے صحیح راستہ پر چل پڑے تو پیچھے والی بھیڑیں بھی بغیر سوچے سمجھے اس کی تقلید کریں گی۔

ہم دنیا نہیں بدل سکتے لیکن اپنی نظر کا وہ چشمہ تو بدل سکتے ہیں جس سے ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ حالات کو بدلنے کے لیے اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا۔ اپنی سوچ کو مثبت رکھنا ہوگا۔

زندگی خوشی اور غم دونوں سے عبارت ہے لیکن اب ہماری اپنی سوچ پر منحصر ہے کہ ہم اس زندگی میں خوشی کو دیکھیں یا غم کو یاد کرکے خوشی کے لمحات بھی ضائع کردیں۔ برا وقت ہر قوم پر آتا ہے اور زندہ قومیں وہی ہوتی ہیں جو امید کا دامن تھام کر اس وقت کو بخوشی جھیل جاتی ہیں اور اچھے وقت کے لیے تیاری کرتی ہیں۔

زندگی میں ایسے کئی واقعات میں نے دیکھے ہیں جن کا ذکر کروں تو یہ صفحات کم پڑ جائیں لیکن یہ واقعات ختم نہ ہوں۔ ایسے واقعات جو امید کو زندہ کرتے ہیں لیکن ہم ان کا تذکرہ نہ کرتے ہیں اور نہ ہی بدقسمتی سے سنتے ہیں۔ اس شخص کی طرح جو اللہ کی بے شمار نعمتیں پا کر بھی ذرا سی تکلیف پر ناشکرا بن کر چلانے

لگتا ہے۔ مانا کہ ہمارے ملک کو دہشت گردی، لوٹ مار اور اس جیسی بے شمار بیماریوں نے گھیر رکھا ہے لیکن باوجود اس کے ایسے لوگ اسی ملک میں بستے ہیں جن کا ان بیماریوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ایسے عام سے لوگ موجود ہیں جن کے پاس لاکھوں کی رقم بھی مل جائے تو وہ واپس کردیتے ہیں۔ جو کسی سے کوئی سوال نہیں کرتے۔ لیکن ہم ان لوگوں کا تذکرہ کبھی نہیں کرتے۔ شاید ہم منفی سوچ کے مالک ہیں۔ اسی لیے آٹے میں نمک کے برابر ان لوگوں کا ذائقہ پورے آٹے میں محسوس نہیں کرپاتے۔ نمک تھوڑا بھی ہو تو پورے آٹے کا ذائقہ بدل سکتا ہے۔ آیئے آج سے ہم بھی اس نمک میں شامل ہو کر اس ملک کی تقدیر بدل دیں کہ آغاز ہمیشہ ایک سے ہوتا ہے۔

# ڈھول کا پول

انتخابات کا ڈھول بج رہا ہے اور عوام اس ڈھول کی تھاپ پر رقص میں محو ہیں۔ ڈگڈگی بجانے والے میدان میں ہیں اور یہ رقص جب تھمے گا جب عوام رقص کے بعد کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ ابھی تو میڈیا کے پنڈت سر جوڑ کر بیٹھے ہیں اور اس پر تجزیہ ہو رہا ہے کہ انتخابات کے پہلے مرحلہ میں کس نے کتنی شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور کس طرح حاصل کی ہے؟ کوئی جیت کے طبلے بجا رہا ہے تو کوئی جیب کٹ جانے کا واویلا مچا رہا ہے۔

ایسے شور میں جب کچھ سمجھ نہیں آتا تو میں بھی عوام کی طرح آنکھیں اور کان بند کر لیتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ عوام کیا محسوس کرتی ہے۔ آپ کسی کے درد کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس درد سے آپ بھی گزریں یا اسے خود پر محسوس کریں تو یقینا آپ درست نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے بھی ایسا ہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ اس تجربہ میں شامل ہو جائیں۔

ذہن کو بالکل خالی کر دیں ہر قسم کے تجزیوں اور خواہشات سے..... آپ خود کو ایک

نئی دنیا میں محسوس کریں گے۔ ایک ایسی دنیا جو خواب نہیں حقیقت ہے۔ جہاں دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ان کو جوڑ کر بائیس نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری عوام ہمیشہ سے تین حصوں میں تقسیم رہی ہے۔ ایک وہ جو کسی پارٹی یا جماعت کا باواسطہ یا بلاواسطہ حصہ ہے اور وہ اسی کو ووٹ کاسٹ کرتی ہے۔ دوسری عوام وہ ہے جو ہوا کے ساتھ چلتی ہے، چڑھتے سورج کو دیکھتی ہے اور پھر اپنا فیصلہ سناتی ہے۔ تیسری عوام وہ ہے جو کسی پارٹی یا جماعت کو پسند نہیں کرتی یا سیاست کو ہی پسند نہیں کرتی۔ عرف عام میں وہ اپنی دنیا میں مگن رہتی ہے۔ ان کو کسی کے آنے جانے سے کوئی غرض نہیں ہے۔

انتخابات میں عموماً پارٹیاں یا جماعتیں اپنے کارکنان، ووٹرز یا حامیوں کو متحرک کرنے کی کوشش کرتی ہیں یا پھر ایسا تاثر دینے کی کوشش کرتی ہیں کہ دوسری قسم کی عوام کو ایسا لگے کہ اگلی بار وہی پارٹی یا جماعت آ رہی ہے۔ پہلی قسم کی عوام اپنی جماعت سے خوش یا ناراض ہوتی ہے تو وہ اس کا اظہار انتخابات کے نتیجہ میں اثر انداز ہو کر کرتی ہے۔ خوش ہو تو ووٹ کاسٹ کرتی ہے ورنہ عموماً کسی کو بھی ووٹ نہیں دیتی۔ یہ تعداد ہر جماعت کی مخصوص ہوتی ہے اس میں اضافہ یا کمی جماعتوں کے نیٹ ورک پر منحصر کرتی ہے۔ جس طرح کسی علاقہ میں سگنل اسی وقت آتے ہیں جب وہاں قریب میں کوئی انٹینا موجود ہو۔ نیٹ ورک کی غیر موجودگی میں آپ پہلی قسم کی عوام کا ووٹ حاصل نہیں کرتے بلکہ دوسری

قسم کے عوام آپ کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ پہلی قسم کا ووٹ ہمیشہ دوسری قسم کے ووٹ سے تناسب میں بہت کم ہوتا ہے۔

آیئے ہم دوسری قسم کے عوام سے یہ جانتے ہیں کہ وہ جماعتوں میں کیا تلاش کرتے ہیں؟ اگر غور کیا جائے تو تین ہی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک نظریہ، دوسرا شخصیت اور تیسرا مفادات۔ اگر کسی جماعت کا نظریہ اس قسم کو متاثر کرے اور اسے یہ یقین ہو جائے کہ وہ جیت جائے گی تو وہ اسی جماعت کو ووٹ ڈالتی ہے۔ لیکن اگر نظریہ پسند نہیں اور شخصیت سے متاثر ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ جیتے گا تو وہ اسے ہی ووٹ دیتا ہے۔ لیکن اگر نظریہ اور شخصیت بھی سامنے نہیں ہے جو اسے متاثر کر سکیں تو وہ اپنا مفاد دیکھتا ہے لیکن یہاں بھی وہ اسے ہی ووٹ دیتا ہے جو جیت رہا ہو۔ اس قسم کی عوام ہارنے والے گھوڑے پر کبھی اپنا ووٹ ضائع نہیں کرتی۔

اب آیئے حقیقت کی دنیا میں جیتنے والوں پر یہ فارمولا لگا کر دیکھتے ہیں کہ یہ کام کرتا ہے کہ نہیں۔ پاکستان کی سیاست میں جمہوریت سے زیادہ آمریت کا دور طویل دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ دوسری قسم کی عوام ہے جو ہر چڑھتے سورج کو پوجتی ہے۔ اس میں اپنا نظریہ، شخصیت اور مفادات تلاش کرتی ہے۔ پھر جب ان تینوں چیزوں میں اس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ

مقبولیت کھونے لگی ہے۔ پہلی قسم کی عوام کبھی بھی آمروں کو سلام نہیں کرتی۔ یہ بس خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے اور خاموشی خاموشی میں ہی اپنا کام کرتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب آمریت کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں آنے والے تمام جرنیلوں نے انتخابات کرائے اور اس میں حصہ بھی لیا۔ انہوں نے عوام کو نظریہ بھی پیش کیا اور مفادات کا چارہ بھی دیا۔ آمریت میں شخصیت ہی سب کچھ ہوتی ہے اس طرح دوسری قسم کی عوام کا ان کو باآسانی مینڈیٹ مل جاتا ہے کیونکہ یہ جیت کا نشان ہوتے ہیں۔

جمہوری حکومتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمارے سامنے جو بڑی جماعتیں دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ بھی اسی فارمولے کے مطابق آتی اور جاتی ہیں۔ مسلم لیگ نواز جو ابھی حکومت میں ہے۔ اس میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ پہلی قسم کی عوام کا نیٹ ورک ان کے پاس پورے پاکستان میں موجود ہے۔ دوسری قسم کی عوام کی اکثریت بھی نواز شریف کے ساتھ ہے۔ اس کو یہ یقین ہے کہ وہ جیت جائیں گے۔ ( اس کی وجوہات بہت سی ہیں کہ عوام کو کیوں یہ یقین ہے ؟ میں یہاں اس کا جائزہ پیش نہیں کر رہا) ان سے نظریہ پاکستان بھی عوام کو مل رہا ہے، آپ اس سے اتفاق کریں یا انکار مگر دوسری قسم کی عوام یہی سمجھتی ہے۔ نواز شریف صاحب کی شخصیت بھی عوام میں مقبول ہے جس کی وجوہات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور تیسرا مفادات بھی اس جماعت سے دوسری قسم کی عوام کو حاصل

ہو رہے ہیں۔ نواز حکومت سے قبل زرداری کی حکومت رہی ہے اس لیے ان پر یہ فارمولا لگا کر دیکھتے ہیں۔ پہلی قسم کی عوام کا نیٹ ورک پورے پاکستان میں اس جماعت کے پاس موجود ہے۔ بے نظیر کی شہادت کے بعد یہ تاثر عام ہو چلا تھا کہ یہی جماعت جیتے گی، جس کے نتیجہ میں دوسری قسم کی عوام کا جھکاؤ اس کی طرف غیر محسوس انداز میں گرا۔ اس جماعت سے روٹی، کپڑا اور مکان کا نظریہ عوام کو ملتا ہے جو مفادات سے بھی قریب تر ہے اور بھٹو کی شخصیت کا آئینہ بھی موجود ہے۔ ان تینوں چیزوں کی موجودگی میں دوسری قسم کا ووٹ لے کر یہ جماعت برسر اقتدار آئی تھی۔ لیکن پانچ سال مفاہمت کی سیاست کے نظر ہو گئے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ کسی جمہوری حکومت نے پانچ سال پورے کیے تھے۔ پاکستان کے عوام کی دوسری قسم ہمیشہ سے باری کی قائل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سیاست کی تاریخ میں جماعتیں آتی اور جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی ایک جماعت نے دوبارہ انتخاب نہیں جیتا۔ یہی تاثر دوسری قسم کی عوام کے ذہنوں میں رہتا ہے۔ مسلم لیگ نون اور پیپلز پارٹی کی باریاں لگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ میں یہاں آمریت کے دور میں آنے والی جمہوری جماعتوں کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ آمریت ہی کے بل پر آتی ہیں۔ مفادات کا ٹولہ ہمیشہ آمروں کے ساتھ دکھائی دے گا۔ ان باریوں کے درمیان ایک مزید سیاسی جماعت تحریک انصاف بھی اپنی جگہ بناتی

دکھائی دیتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ سیاست میں نوآموز ہے اسی لیے اس کا نیٹ ورک بھی پورے پاکستان میں پوری طرح نہیں بن پایا۔ پہلی قسم کی عوام میں نئے ووٹرز کو اس جماعت نے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ دوسری قسم کی عوام کو تبدیلی کا نظریہ اس جماعت میں دکھائی دے رہا ہے۔ دیگر دونوں جماعتوں سے ناراض عوام بھی اس جماعت کی طرف متوجہ ہیں۔ان کو اپنے مفادات بھی اس جماعت سے پورے ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ عمران خان کی شخصیت کے سحر میں عوام پہلے ہی دیوانی ہے۔اس طرح تینوں چیزوں کی موجودگی اور جیت کا یقین دوسری قسم کی عوام کو اس کی طرف بھاری تعداد میں لانے میں کامیاب رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پہلی قسم کی عوام کا نیٹ ورک نہ ہونے کے باعث اس کو وہ کامیابی نہ مل سکی جو اسے حکومت میں لانے میں کامیابی دلا سکتی کیونکہ ووٹر کا ووٹ اسی وقت کیش ہوتا ہے جب آپ کا بینک علاقہ میں موجود ہو بصورت دیگر آپ کا چیک کیش نہیں ہوسکے گا۔

آخر میں اس فارمولہ پر ایم کیو ایم کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں جسے یہ گمان ہے کہ وہ پورے پاکستان کی جماعت ہے لیکن اب تک اسے بھی سندھ کے شہری علاقوں کے علاوہ دیگر جگہوں پر اس طرح کامیابی نہیں مل سکی جیسا کہ دیگر دو جماعتوں کو ملی ہے۔ پہلی قسم کی عوام کا دائرہ اب تک پورے پاکستان میں نہیں پھیل پایا۔ دوسری قسم کی عوام کو نظریہ مہاجر سے اب تک ایم کیو ایم نہیں

نکال پائی۔ کہنے کو تو وہ یہی کہتی ہے کہ وہ نچلے طبقے کی متوسط جماعت ہے اور وہ وڈیرہ شاہی سے نجات چاہتی ہے لیکن اس نظریہ کو پورے پاکستان میں اس لیے پذیرائی نہیں ملی کہ ایم کیو ایم پر مہاجر نظریہ کی چھاپ اب تک نہیں مٹ پائی اور اس میں اس جماعت کا اپنا قصور بھی ہے کیونکہ وہ جب بھی بند گلی میں داخل ہوتی ہے فوراً مہاجر کارڈ استعمال کرتی ہے۔ دوسری قسم کی عوام کو یقین نہیں کہ یہ پورے پاکستان میں کامیاب ہو کر حکومت بنا سکتی ہے اسی لیے اس کا ووٹر اب تک شہری سندھ تک محدود ہے جہاں دوسری قسم کی عوام کو مہاجر نظریہ، الطاف حسین کی شخصیت اور مفادات حاصل ہو رہے ہیں اور یہ یقین بھی کہ وہ جیت جائیں گے۔

میں نے یہاں صرف ان جماعتوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جو پورے پاکستان میں اپنے امیدوار اتنی بڑی تعداد میں کھڑے کرتے ہیں کہ جس سے عوام کو امید ملے کہ وہ جیت کر حکومت بنانے جا رہے ہیں۔ ملک میں نہ جیتیں کم از کم صوبے میں تو حکومت حاصل کر ہی لیں گے۔ اسی امید کے پیچھے دوسری قسم کی عوام بھاگتی ہے۔ اپنے مفادات حاصل کرتی ہے اور اگر حاصل نہ ہوں تو پھر اگلے الیکشن کا انتظار کرتی ہے۔ تیسری قسم کی عوام کا تذکرہ میں نے صرف بطور تبرک کیا ہے جس طرح سیاسی جماعتیں ان کے نام لے کر حکومتیں کرتی ہیں۔ ورنہ یہ قسم نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں ہے۔ آپ کا شمار کس قسم میں ہوتا ہے ذرا خود ہی

جائزہ لیں۔ لیکن میں یہ بات باآسانی کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم تیسری قسم کی عوام میں آپ کا شمار نہیں ہوتا کیونکہ یہ قسم اس قسم کے مضامین کبھی نہیں پڑھتی۔ کیوں کیا خیال ہے؟؟.....

# ایاز صادق ہو گئے

''ایاز صادق نے دو تہائی اکثریت سے دوبارہ سپیکر کا انتخاب جیت لیا۔''

''اس کا مطلب ہے محمود و ایاز ایک ہو گئے ہیں۔ ''

''محمود کا تو پتا نہیں لیکن ایاز کا پتا ہے کہ وہ اب صادق ہو گئے ہیں۔ ''

''یہ صداقت کی سند انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟ ''

''عوام اور پارلیمنٹ نے انہیں یہ سند جیت کی صورت میں دی ہے۔ ''

''تمہارا مطلب ہے ووٹ کے نتیجہ میں ایاز صادق ہو گئے ہیں۔ ''

صادق ہی نہیں ہوئے دو بار ایک ہی پارلیمنٹ سے اسپیکر بننے والا پہلا پاکستانی بھی ''

''بن گئے ہیں۔

''تم نوٹ کی بات کر رہے ہو یا ووٹ کی کھل کر کہو۔ ''

کھل کر کیسے کہوں جب پارلیمنٹ والے کھل کر نہیں بول سکتے اور انہیں بھی ووٹ پر ''

سچ لکھنا پڑتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ عوام نوٹ پر لکھتے ہیں اور پارلیمنٹ والے ووٹ

''پر۔

''ایسا کیا لکھا ہے ووٹ پر اور کس نے لکھا ہے ؟''

سرخ روشنائی سے کسی نے اپنا کلیجہ نکال کر خون میں ڈبو کر لکھا ہے کہ یہ پارلیمنٹ ''

ملک دشمن، عوام دشمن اور کسان دشمن ہے اس لیے اسے ووٹ دینا جرم ہے۔

”

”اس کی تو تحقیقات ہونا چاہیے کہ یہ پارلیمنٹ کا خفیہ راز کس نے افشا کیا ہے۔ ”

یہ کون سا خفیہ راز ہے جو عوام کو پتا نہیں تھا۔ عوام تو پہلے ہی اس طرح کی باتیں ”
نوٹوں پر تحریر کرتی رہتی ہے۔ لگتا ہے اس طرح کی تحریروں کا سرغنہ پارلیمنٹ میں بھی
”پہنچ گیا ہے۔

”یہ تو بہت خطرناک بات ہے لیکن یہ کون ہو سکتا ہے؟ ”

جمشید دستی کا نام سننے میں آ رہا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ جس نے ”
”بھی لکھا ہے سچ لکھا ہے لیکن میں نے یہ سچ لکھنے کی غلطی نہیں کی۔

” اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہی شخص پارلیمنٹ کے راز پبلک کرتا رہتا ہے۔ ”

”اس کو تو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا انچارج بنا دینا چاہیے۔ ”

”دماغ خراب ہوا ہے بجائے سزا دینے کے انعام دینے کی بات کر رہے ہو۔”

ہمارے ملک میں تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس کو سزا دینی ہو اسے وزیر بنا دیا جاتا ہے ”
”اور جسے انعام دینا ہو اسے او ایس ڈی بنا دیا جاتا ہے۔

پارلیمنٹ میں اسی لیے ملک دشمن، عوام دشمن اور کسان دشمن بڑی تعداد میں پہنچ ”
”گئے ہیں۔

رینجرز والے تو پہلے ہی ان کی تلاش میں عوام میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان ''
''کو کیا پتا کہ وہ یہاں پارلیمنٹ میں چھپے ہوئے ہیں۔
پارلیمنٹ ملک دشمنوں کے چھپنے کی محفوظ پناہ گاہ تو نہیں ہو سکتی البتہ عوام دشمن اور ''
کسان دشمن کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کیونکہ عوام کے دشمن عوام سے ووٹ لے کر
'' یہاں آ جاتے ہیں اور پھر عوام انہیں اپنے علاقوں میں تلاش ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔
وہ ان کے دیے گئے نوٹوں پر پھر ان کی یاد میں اکثر محبت بھرے پیغامات لکھ کر بھیجتے''
ہیں لیکن وہ راستے ہی میں کہیں اسٹیٹ بینک والے اچک لیتے ہیں اور ان تک بات نہیں
'' پہنچ پاتی جہاں تک پہنچنی چاہیے۔
'' اِچھٹی نہ کوئی سندیس ..... جانے وہ کون سا دیس جہاں تم چلے گئے''

☆.....☆

# نیا صوبہ، نیا پاکستان

''نیا پاکستان تو بنا نہیں لیکن اب یہ نئے صوبے والے میدان میں آ گئے ہیں۔''

''یہ صوبے والے کافی عرصہ سے میدان میں ہیں لیکن اب پرانا مال نیا کر کے بیچنا چاہتے ہیں۔''

'' پرانا مال نیا ہو کر کیسے بک سکتا ہے؟''

''تم نے سنا نہیں ..... سب بیچ دے !''

'' سب بیچ کر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا تو پھر کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہاں سب بکتا ہے''

'' اس طرح تو ہم نئے کے چکر میں پرانے سے بھی جائیں گے۔''

'' نہیں پرانے ہمارا ساتھ اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والے۔ اسی لیے انہوں نے بھی ''نئے'' کا لیبل اپنے ساتھ لگا لیا ہے۔''

''عوام کو چاہیے کہ وہ نقالوں سے ہوشیار رہیں اور برانڈ خریدتے وقت اصلی اور نقلی کی پہچان کر لیں۔''

''آج کل اصلی اور نقلی میں بالکل فرق نہیں رہا۔ کل تک عمران صاحب نئے پاکستان بنا رہے تھے اب نواز شریف صاحب نے بھی لبرل پاکستان کا نعرہ لگا کر نئے پاکستان کی بنیاد رکھ دی ہے۔''

شاید اسی لیے اقبال کو بھی چھٹی نہیں مل سکی کیونکہ وہ لبرل بننے کے لیے تیار نہیں ''
تھے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ قائد اعظم کو ضرور چھٹی مل جائے گی جو کام ،کام اور بس کام
''کرتے کرتے تھک گئے ہیں

چھٹی کام کرنے والوں کو دی جاتی ہے، سونے والوں کو نہیں جو بس خواب ہی دیکھتے ''
''رہتے ہیں چاہے وہ پرانے پاکستان کا خواب ہو یا نئے پاکستان کا۔

''اقبال کا خواب پورا ہو یا نہ ہو لیکن قائد کا کام ہو جائے گا۔''

''کون سے والے قائد کی بات کر رہے ہو، قائد تحریک، قائد عوام یا قائد اعظم کی۔ ''

''قائد تو بس ایک ہے جسے ہم ''بھائی'' کہتے ہیں باقی سب پرانا مال ہے۔ ''

''پرانا مال بیچوگے تو نیا ملے گا ناں..... ورنہ گول مال ہے سب گول مال ہے۔ ''

''تم ہمارے مال کو گول مال بولوگے تو ہم تمہارا بوریا بستر گول کر دیں گے۔''

''بوریا بستر گول کرنے کی ضرورت نہیں وہ پہلے ہی ہم دھرنے میں گول کر چکے ہیں۔''

''دھرنا دینے سے 'نیا پاکستان' نہیں بنتا''

''صرف نعرے لگانے سے بھی 'نیا صوبہ' نہیں بنتا۔ ''

''اس طرح تو پھر کچھ بھی نیا نہیں بنے گا۔''

کیا ہم مل جل کر پرانا پاکستان نہیں بنا سکتے جس کا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا''
اور جس کے لیے قربانیاں دیں تھیں۔ ایک ایسی ریاست کا خواب جو

مدینہ کی طرح ہو جہاں مہاجر اور انصار دونوں بھائی بھائی ہوں۔ جہاں کوئی شیعہ سنی نہ ہو بلکہ مسلمان ہو۔ جہاں ایک یہودی بھی امن و شانتی سے رہ سکتا ہو۔ جہاں کوئی بھوکا نہ سوئے۔"

"یہ خواب پرانے ہو گئے..... اب ہمیں خواب بھی نئے دیکھنے ہیں۔"

"اس طرح تو عوام بس خواب ہی دیکھتی رہے گی، انہیں تعبیر کون دے گا؟"

"جب تک ہم خود بیدار نہیں ہوں گے، اس وقت تک کچھ بھی بدلنے والا نہیں ہے۔"

☆.....☆

# فیس بک کا شیطان

''فیس بک کا شیطان اب کمپیوٹر سے باہر نکل آیا ہے۔''

'' بوتل کا جن تو سنا تھا، یہ فیس بک کا شیطان کب سے نکل آیا؟''

'' جب یہ فیس بک ہمارے پاس آیا تھا تو اس کا فیس کتنا میک اپ کرکے خوبصورت دکھایا گیا تھا، جیسے نئی نویلی دلہن کو بیوٹی پارلر سے تیار کروایا گیا ہو۔''

'' آپ بھی تو ہر نئی چیز کے پیچھے ایسے بھاگتے ہیں جیسے پیاسا سراب کے پیچھے۔''

'' اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہماری قوم بہت پیاسی ہے وہ سراب ہو یا شراب کسی چیز میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔''

'' اگر اپنے بزرگوں سے تمیز سیکھی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔''

''اب تم ہمیں تمیز نہ سکھاؤ یہ بتاؤ کہ فیس بک نے کیا کردیا ہے؟''

'' کیا تو کچھ نہیں پوری دنیا میں ہمارا فیس خراب کرکے رکھ دیا ہے۔''

'' فیس تمہارا ٹھیک کب تھا؟ نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دینے سے کوئی اسلامی اور جمہوری نہیں ہوجاتا۔''

'' تم لاکھ میری قوم کو برا کہو یا سمجھو لیکن میری قوم میں عورت کا احترام یورپ یا دیگر ترقی یافتہ قوموں سے لاکھ گنا بہتر تھا۔ یہاں آپ کو ایسی

''اجتماعی زیادتیوں والی خبریں کبھی سننے کو نہیں ملتی تھیں۔
میرے بھولے تم اس وقت کی بات کر رہے ہو جب لڑکے لڑکیوں کی دوستیوں کا رواج'' نہیں تھا۔ آج پاکستان 'لبرل پاکستان' بن چکا ہے۔اب بنیاد پرستی کی باتیں کرنا چھوڑ دو ''

اپنی مٹی پہ ہی چلنے کا سلیقہ سیکھو، سنگ مرمر پر چلوگے تو پھسل جاؤگے۔بنیاد کے بغیر '' ''کوئی عمارت نہیں اٹھ سکتی

''تمہیں لڑکے لڑکیوں کی دوستیوں پر اعتراض کیا ہے؟ ''
کوئی اعتراض نہیں اگر مجھے کسی کی بہن سے دوستی کرنی ہو تو لیکن مجھے سخت اعتراض'' ''ہے کہ کوئی میری بہن کے ساتھ دوستی کرنے کی بات کرے۔
''یہی تو شدت پسندی ہے جس کی وجہ سے ہمارا فیس دنیا کے سامنے خراب ہو رہا ہے۔ '' ''!ہمیں روز حشر فیس دکھانا ہے، فیس بک نہیں ''
بات تو تمہاری ٹھیک ہے .....لبرل پاکستان میں فیس بک کا نشہ شیطان کی طرح کچھ'' ایسے رگوں میں سرایت کر گیا ہے کہ اب ہم اللہ کو کیا فیس دکھائیں گے سوچا ہی نہیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں اس بات کو فیس بک پر اتنا شیئر کرتے ہیں کہ اب کوئی حوا کی ''بیٹی اس شیطان کی ہوس کا شکار نہ ہو۔
''بیمار ہوئے جس کے سبب اب دوا بھی اسی سے لینے کا پروگرام ہے۔''
''میں تو فیس بک پر ہر اچھی بات کو آگے شیئر کر دیتا ہے اب اس میں کیا خرابی ہے؟ ''

تم ہر اس اچھی بات کا ذکر کر رہے ہو جس کے آخر میں لکھا ہوتا ہے کہ شیطان آپ ''
''کو اسے شیئر کرنے سے روکے گا لیکن آپ نے اسے ضرور شیئر کرنا ہے۔
بالکل ایسی چیزیں تو میں بالکل نہیں روکتا بلکہ سب دوستوں کو ٹیگ بھی کر دیتا ہوں۔ ''
''

تم نے حدیث نہیں پڑھی کہ جو شخص بغیر کسی تحقیق و تصدیق کو کسی بات کو آگے''
''پھیلاتا ہے وہ بھی اس جرم میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔
اب تحقیق و تصدیق کیسے کی جائے، جب ہر چیز دو نمبر فوٹو شاپ سے تیار ہو رہی ہو، ''
دو نمبر ویڈیوز بھی تیار ہو جاتی ہیں اور تو اور دو نمبر فتوے تو دعوت دین کا کام کر رہے
''ہیں۔
اگر تحقیق نہیں کر سکتے تو لائیک بھی نہ کیا کرو۔ اچھی بات کو فیس بک کے لائیک کی''
'' نہیں بلکہ آپ کے دل کے لائیک کی ضرورت ہوتی ہے۔
میں تو اہل ارباب سے یہی کہوں گا کہ وہ اس فیس بک کے شیطان کو بوتل میں بند ''
کریں ورنہ یہ ہماری نسلوں کو دیمک کی طرح چاٹ جائے گا اور فیس کی جگہ صرف ایک
''بک رہ جائے گی جس میں لکھا ہوگا کہ فیس بک استعمال کرنے کا انجام۔
میرے خیال میں تو ہمیں فیس بک کو چھوڑ کر اللہ کی بک کو اپنانا چاہیے جسے ہم نے''
غلافوں میں چھپا کر اپنی دسترس سے دور بہت ہی اوپر رکھ چھوڑا ہے، اسی میں ہماری
''نجات کا ذریعہ ہے۔
''چلو میں سب سے پہلے تمہاری بات کو دل سے لائیک کرتا ہوں۔''

"!!......میں بھی"

☆......☆

# بلدیاتی انتخابات: معلوم بمقابلہ نامعلوم

''ایک بار پھر بلدیاتی الیکشن میں بہت سے نامعلوم کھڑے ہوگئے ہیں۔ ''

''لیکن الیکشن کے بعد تو معلوم چل جائے گا کہ اس کا کس سیاسی جماعت سے تعلق ہے؟''

مشکل ہے، ابھی تک تو صرف یہی معلوم چل سکا ہے کہ ان کا تعلق سیاسی جماعت سے ''

''ہے۔

''کیا یہ نامعلوم سیاسی جماعت ہے ؟''

جماعت تو سب کو معلوم ہے لیکن اس کا تعلق سیاسی ہونے پر شبہ ہے، کیونکہ اسے ''

''نامعلوم لوگوں نے بدنام کر دیا ہے۔

''تو پھر یہ جماعت ایسے نامعلوم لوگوں سے چھٹکارا کیوں نہیں حاصل کرتی؟ ''

''انہیں ڈر ہے کہ اگر چھٹکارا حاصل کرلیا تو یہ جماعت ہی کہیں ختم نہ ہوجائے۔''

انہیں عوام کے اعتماد پر بھروسہ کرنا چاہیے اور جلد از جلد ان نامعلوم افراد سے ''

''دستبرداری کا اعلان کرنا چاہیے۔

''اعلان دستبرداری تو کب کا کر رہے ہیں لیکن کوئی یقین ہی نہیں کرتا۔''

''یہ تو کھلی ناانصافی ہے۔ ''

''ناانصافی تو معلوم لوگوں کے ساتھ ہو رہی ہے اور یہ بات تو سب کو معلوم ہے۔ ''

''جب یہ بات سب کو معلوم ہے تو پھر اس بار الیکشن میں تبدیلی ضرور آئے گی۔ ''

''مشکل ہے، جب تک نامعلوم شہر میں موجود ہیں، تبدیلی نہیں آسکتی۔ ''

''شاید اسی لیے رینجرز والے کہہ رہے تھے کہ آپریشن کروالو یا الیکشن۔''

آپریشن کروا کروا کر تو شہر کی حالت آج یہ ہو گئی ہے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا'' ''کی۔

''تمہارا مطلب آپریشن سے شہر میں امن نہیں آیا۔''

یہ سب وقتی امن ہے، مرض کو جڑ سے ختم کرنا ہوگا ورنہ یہ ناسور کینسر کی طرح پھر '' ''بڑھ سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

''تو تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟ ''

''یہ لفظ 'چاہیے' کو ڈکشنری سے نکال دینا چاہیے۔ ''

''وہ کیوں؟''

اس لیے کہ کوئی بھی کام اس 'چاہیے' کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا۔ جو کرنا '' ''ہے فوراً کریں۔ چاہئے کا وقت ختم ہوگیا۔

''تو پھر کیا کریں؟ ''

آپریشن اور الیکشن دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ پورا ''

پلازہ کھڑا ہو جائے اور پھر اچانک خیال آئے کہ یہ کیسے قبضہ کی زمین پر کھڑا ہو گیا؟ کوئی ان سے پوچھے کیا یہ راتوں رات کھڑا ہو گیا ہے یا کسی جن نے اسے کوہ قاف سے یہاں رکھ دیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے انتخاب اور احتساب دونوں کو وقت پر ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔"

"پھر وہی چاہیے؟"

مطلب ساتھ ساتھ ہوں۔ اس طرح معلوم اور نامعلوم میں فرق خود ہی واضح" ہو جائے گا۔"

دیکھو تبدیلی تم سے ہے۔ اگر تم آج بھی باہر نہ نکلے تو پھر یہ نہ کہنا کہ معلوم نہیں تھا کہ" کون اپنا ہے اور کون پرایا۔"

# میئر تو اپنا ہونا چاہیے

''میئر تو اپنا ہونا چاہیے۔''

'' بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اپنے اور پرائے کا فرق ختم ہوگیا ہے۔''

'' وہ کیسے ؟''

'' جو زخم اپنوں نے لگائے ہیں وہ غیروں نے بھی نہیں لگائے۔ گویا
ہمیں اپنوں نے لوٹا غیروں میں کہاں دم تھا
میری کشتی وہاں ڈوبی جہاں پانی کم تھا

'' لیکن اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں، سو زخم لگا لیں اپنے ہی رہتے ہیں۔مار بھی دیں تو چھاؤں میں پھینکتے ہیں۔''

'' ہاں اسی لیے ہم انہیں تیس سالوں سے منتخب کرتے آرہے ہیں، اسی امید کے ساتھ کہ جیسے بھی ہیں ، اپنے تو ہیں۔''

''لیکن ابھی تو اپنوں کے اوپر ظلم ہورہے ہیں۔ انہیں ٹارگٹ کلنگ پر گرفتار کیا جارہا ہے۔ بھتہ خوری کی اجازت نہیں دی جارہی اور تو اور جو زمین ہماری ہے اس پر بھی قبضہ نہیں کرنے دیا جاتا۔''

'' بے شک جس کے پاس مینڈیٹ ہو اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری اور زمینوں پر قبضے کہاں نہیں ہوتے۔ لیکن گرفتار صرف ہمیں

''ہی کیا جارہا ہے۔
پھر اس پر مزید ظلم یہ کہ بھائی کا نام لینے پر بھی پابندی لگا رکھی ہے۔ بھائی نے کیا نہیں ''
کیا اپنوں کے لیے۔ اپنوں کے لیے وہ گھر سے بے گھر ہیں۔انہیں اپنی جان کی بھی کوئی
'' پروا نہیں۔
یعنی ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت.....ہمارے آباء واجداد نے تو صرف بھارت ''
سے پاکستان ہجرت کی تھی لیکن ہمارے بھائی نے تو پاکستان سے.برطانیہ ہجرت کرکے
'' !ایک سچا قائد ہونے کا ثبوت دے دیا ہے
بالکل ! اگر ان کی جان کو خطرہ نہ ہوتا تو وہ کب کے پاکستان آجاتے لیکن یہ تو اپنوں ''
''نے انہیں وہیں روک رکھا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ بھائی پاکستان آئیں۔
اپنوں کا خوف بھی صحیح ہے..... ہمیں منزل نہیں رہنما چاہیے، اور اگر رہنما چلا گیا تو ''
'' منزل بھی نہیں ملے گی۔
اللہ ہمارے بھائی کو ہزار.برس کی عمر دے کیونکہ منزل تو ہمیں اتنی جلدی ملتی دکھائی ''
''نہیں دے رہی۔
منزل تو جب ملے گی جب ہمیں منزل چاہیے ہوگی، ہمیں تو منزل چاہیے ہی نہیں ہے۔''
''

''کیا مطلب؟ ''
مطلب یہ کہ ہم کبھی کوٹہ سسٹم کے نام پر ووٹ ڈال کر انتخاب نہیں بلکہ ''

"..... ریفرنڈم کرتے ہیں اور کبھی نئے صوبے کے نام پر ریفرنڈم
"پتا نہیں ان ریفرنڈمز کے نتائج کیا نکلیں گے؟"
نتائج کیا نکلنے ہیں ..... اگلے انتخاب پر پھر ایک نیا ریفرنڈم ہوگا۔ کیونکہ ہمیں منزل" "نہیں چاہیے۔
اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہمیں اختیارات نہیں ملے ورنہ بھائی کی تو بہت" "قربانیاں ہیں۔
اتنے سالوں سے ہم سندھ کی حکومت میں ہیں لیکن ہمیں اختیارات نہیں ملتے، کچھ" "اور مل جاتا ہے۔
یہ ہماری لازوال قربانیاں ہیں کہ ہم سب کچھ ہونے کے باوجود پھر بھی بے اختیار" "رہنا پسند کر لیتے ہیں۔
"صحیح کہا اگر اختیارات ہمیں مل جائیں تو ہم تو کراچی کو لندن ضرور بنا دیں۔"
"کچھ بے وقوف لوگ کہتے ہیں کہ میئر تو دیانتدار ہونا چاہیے۔"
دیانتدار میئر کا کراچی میں کیا کام؟..... دیانتداری سے کام کرنا ہے تو دبئی جا کر کرو۔" "
دبئی سے یاد آیا کہ سابق میئر مصطفیٰ کمال کو بھی ہم نے وہاں دیانتداری سے کام" "کرنے کے لیے بھیجا ہے تاکہ ملک کا نام روشن ہو۔
ویسے بھی ہمارے پاس کون سا مصطفیٰ کمال کی کمی ہے۔ کسی بھی مصطفیٰ کو کھڑا"

”کردو وہ یہ کمال کر سکتا ہے۔
یعنی ہم اب کراچی والے میئر ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔اس میں ہم خود کفیل ہو چکے “
”ہیں۔
“ ! بے شک ”
لیکن ہم نے اللہ کی نعمت یعنی نعمت اللہ خان کو دوبارہ منتخب نہ کرکے بہت بڑا کفرانِ “
”نعمت کیا ہے۔کیا وہ اپنا نہیں تھا۔
اپنے اور غیر کی سند تو لندن والے ہی دیتے ہیں ورنہ ہمیں کیا پتا کہ کون اپنا اور کون“
”پرایا ہے؟
صحیح کہا اپنے اور پرائے کا فرق ہی مٹ گیا ہے۔ہم اپنے اور پرائے کی تمیز بھی نہیں “
”کر سکتے۔

تو پیار ہے کسی اور کا، تجھے چاہتا کوئی اور ہے
تو پسند ہے کسی اور کی، تجھے مانگتا کوئی اور ہے

# دُھول چہرے پر تھی

آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو آئینہ نہ دیکھتا ہو۔ کوئی اسے روز دیکھتا ہے اور کوئی اسے بار بار دیکھتا ہے۔ ہم اس میں کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ یہی کہ ہم کیسے لگ رہے ہیں!..... یہ ہمیں ایسا ہی دکھاتا ہے جیسا ہم نظر آتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو خود نہیں دیکھ سکتے اسی لیے آئینہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن یہ آئینہ ہمیں صرف ہماری شکل کے خدوخال ہی دکھاسکتا ہے۔ آپ کی شخصیت میں چھپے خدوخال کو یہ نہیں دکھا سکتا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہمیں اپنی شکل وصورت کو ٹھیک کرنے کی فکر تو لگی رہتی ہے مگر اپنی شخصیت کو نکھارنے کی فکر ہمیں نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو اس کے لیے ہم کچھ نہیں کرتے۔ کوئی ہماری شخصیت میں چھپے منفی پہلوؤں کو آئینہ دکھائے تو ہم برا مان جاتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ہیرو یا ہیروئن ہی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو ہم ولن سمجھتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت کو آئینہ میں نہیں دیکھتے۔ آیئے آج ہم اپنی شخصیت کو بھی آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کریں، اس سے قبل کہ کوئی ہمیں آئینہ دکھائے اور ہم برا مان جائیں۔

آپ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا دل محبت سے خالی ہو۔ انسان اس دنیا میں آتے ہی جس جذبہ سے مانوس ہوتا ہے وہ جذبہ محبت کا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ جذبہ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملتا ہے جس کے باعث شخصیتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ والدین کا پیار بچوں کے لیے بالکل فطری ہے لیکن کسی بھی وجہ سے کچھ بچے اس پیار سے محروم رہ جاتے ہیں یا انہیں ویسا نہیں مل پاتا جیسا ہر بچے کو ملنا چاہیے۔ نتیجہ بڑے ہو کر وہ بچہ دنیا سے پیار چھینتا ہے یا پیار کرنا نہیں جانتا۔ آپ نیچے دیئے گئے آئینہ میں اپنی شکل تلاش کریں۔

میں اپنی اولاد سے بہت محبت کرتا ہوں۔ لیکن میرے پاس وقت نہیں ہے ان کے لیے۔

میں انہیں پیار سے نہیں چومتا کیونکہ مجھے یہ بات معیوب محسوس ہوتی ہے یا مشکل محسوس ہوتی ہے۔ البتہ ان کی غلط حرکتوں یا شرارتوں پر انہیں مارنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بچوں کو ڈانٹنا بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ خراب ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ ان کی شخصیت ہم آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ ایک بدوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے۔ آپؐ نے اپنے نواسوں حضرت حسنؓ و حسینؓ کو گود میں لے رکھا تھا اور انہیں چوم رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بدوی کو حیرت ہوئی اور وہ کہنے لگا کہ میرے تو کئی بچے ہیں لیکن میں تو انہیں نہیں چومتا۔ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہارے دل سے اللہ نے محبت کا جذبہ نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپؐ نے کبھی بچوں کو نہیں ڈانٹا بلکہ پیار محبت سے بچوں کو شفقت سے سمجھایا۔

آپ کے ساتھ اگر آپ کے ماں یا باپ نے پیار محبت میں کمی رکھی ہے تو آپ اپنی اولاد کو یہ دیں ورنہ وہ بھی آپ کو بڑھاپے میں وقت نہیں دیں گے۔ آج میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں۔ یہ مکافاتِ عمل کہیں توڑ کے گا اور اسے آپ نے ہی روکنا ہے۔

مشہور ادیب وکالم نگار جاوید چوھدری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

شہر میں کوئی دکان نہیں کھلی تھی، گلیوں میں کوئی ذی روح نہیں تھا، بس ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے دانتوں پر دانت جمائے چلتے جا رہے تھے، چلتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ریلوے سٹیشن آ گیا، ہم پلیٹ فارم پر آ گئے، جہاں زندگی کے کچھ آثار تھے، ہم سب سے پہلے چائے کے کھوکھے پر گئے اور ہاتھی کا پتا پوچھا، جواب میں چائے والے نے قہقہہ لگا کر ہمیں آگے بھیج دیا۔ ہم پان سگریٹ کی ریڑھی پر گئے اور ہاتھی طلب کیا اس نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ سے ٹکٹ گھر کی طرف اشارہ کر دیا ... ہم بکنگ کلرک کے پاس گئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو میرے بیٹے نے ہاتھی کا مطالبہ کر دیا، یہاں، بھی

نتیجہ تانبائی کی دکان سے مختلف نہ نکلا۔ یہاں پہنچ کر علی زچ ہو گیا، اس نے منہ بسورتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچ کر ریلوے سٹیشن سے باہر لے آیا، ہم عین چوراہے میں کھڑے ہو گئے، میں نے شفقت سے اس کے سرد ہوتے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر ہوا میں بوسہ دے کر پوچھا: ''بیٹا اب بتاؤ کہاں جائیں؟'' علی نے اوپر میری طرف دیکھا اور پھر روہانسا ہو کر بولا: ''ابو میرا خیال ہے ہاتھی دکانوں پر نہیں ملتے۔'' میں نے نیچے جھک کر اس کا مفلر درست کیا اور پھر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: '' ہاں یار میرا بھی ایسا ہی خیال ہے اگر تم کہو تو کل چڑیا گھر والوں سے پوچھ لیتے ہیں، اگر کہیں سے ہاتھی ملتا ہوگا تو جا کر خرید لیں گے کیوں؟''
ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' علی نے پر جوش لہجے میں کہااور ہم دونوں واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ میری بیوی اور میرے والد گھر کے باہر ہمارا انتظار کر رہے تھے، علی نے میرا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کر میرے والد کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میرے والد نیچے جھکے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے: ''کیوں پھر ہو آئے بازار سے؟'' علی نے سر اوپر اٹھایا اور چلا کر بولا: ''دادا ابو، دادا ابو، ہاتھی دکانوں پر نہیں ملتے، اگر ملتے ہوتے تو میرے ابو مجھے ضرور خرید کر دیتے۔'' ننھے علی کے یہ الفاظ میرے والد پر بم کی طرح گرے، ان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں اپنے آنسو چھپاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دانشور نے روک کر

آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ جب خاموشی کا وقفہ ناقابل برداشت ہو گیا تو ہم میں سے ایک نے آنسوؤں کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا: ''یار آپ کے والد کے منہ سے چیخ کیوں نکلی تھی؟'' دانشور نے دبیز شیشوں والا چشمہ گود سے اٹھایا اور اسے اپنی ناک پر جما کر بولا: ''اس لئے کہ بچپن میں جب ایک بار میں نے ہاتھی خریدنے کی ضد کی تھی تو میرے والد نے تھپڑ مار مار کر میرے گال سرخ کر دے تھے''۔

ہم تینوں خاموش تھے، ہم تینوں اپنے اپنے بچپن کے ہاتھی تلاش کر رہے تھے، ہم تینوں اپنے اپنے گال سہلا رہے تھے، ہم تینوں اپنے اپنے بچوں کو یاد کر رہے تھے۔

ایک 85 سالہ عمر رسیدہ باپ اپنے 45 سالہ بیٹے کے ساتھ گھر کے ھال نما کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کوّے نے کھڑکی کے قریب آ کر شور مچایا۔ باپ کو نجانے کیا سوجھی، اُٹھ کر بیٹے کے پاس آیا اور اُس سے پوچھا، بیٹے یہ کیا چیز ہے؟ بیٹے نے جواب دیا؛ یہ کوّا ہے۔ یہ سُن کر باپ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر اُٹھ کر اپنے بیٹے کے پاس کر آیا اور دوبارہ اُس سے پوچھا، بیٹے؛ یہ کیا ہے؟ بیٹے نے حیرت کے ساتھ باپ کی طرف دیکھا ور پھر اپنا جواب دُہرایا: یہ کوّا ہے۔ کچھ دیر کے بعد باپ پھر اُٹھ

کر آیا اور تیسری بار پوچھا: بیٹے یہ کیا ہے؟ بیٹے نے اپنی آواز کو اُونچا کرتے ہوئے کہا؛ ابا جی یہ کوّا ہے، یہ کوّا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ پھر اُٹھ کر آیا ور چوتھی بار بیٹے سے مخاطب ہو کر پوچھا؛ بیٹے یہ کیا ہے؟ اس بار بیٹے کا صبر جواب دے چکا تھا، نہایت ہی اُکتاہٹ اور ناگواری سے اپنی آواز کو مزید بُلند کرتے ہوئے باپ سے کہا؛ کیا بات ہے، آج آپکو سُنائی نہیں دے رہا کیا؟ ایک ہی سوال کو بار بار دُہرائے جا رہے ہو۔ میں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ یہ کوّا ہے، یہ کوّا ہے۔ کیا میں کسی مشکل زبان میں آپکو یہ سب کچھ بتا رہا ہوں جو اتنا سادہ سا جواب بھی نہ تو آپ کو سنائی دے رہا ہے اور نہ ہی سمجھ آ رہا ہے! اس مرتبہ باپ یہ سب کچھ سننے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس باہر آیا تو ہاتھ میں کچھ بوسیدہ سے کاغذ تھے۔ کاغذوں سے لگ رہا تھا کہ کبھی کسی ڈائری کا حصہ رہے ہونگے۔ کاغذ بیٹے کو دیتے ہوئے بولا، بیٹے دیکھو ان کاغذوں پر کیا لکھا ہے؟

بیٹے نے پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا؛ آج میرے بیٹے کی عمر تین سال ہو گئی ہے۔ اسے کھیلتے کودتے اور بھاگتے دوڑتے دیکھ دیکھ کر دِل خوشی سے پاگل ہوا جا رہا ہے۔ اچانک ہی اُسکی نظر باغیچے میں کائیں کائیں کرتے ایک کوّے پر پڑی ہے تو بھاگتا ہوا میرے پاس آیا ہے اور پوچھتا ہے؛ یہ کیا ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ یہ کوّا ہے مگر اُسکی تسلی نہیں ہو رہی یا شاید میرے منہ سے سن

کر اُسے اچھا لگ رہا ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد آ کر پھر پوچھتا ہے یہ کیا ہے اور میں ہر بار اُسے کہتا ہوں یہ کوّا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ سوال 32 بار پوچھا ہے اور میں نے بھی اُسے 32 بار ہی جواب دیا ہے۔ اُسکی معصومیت سے میرا دِل اتنا خوش ہو رہا ہے کہ کئی بار تو میں جواب دینے کے ساتھ ساتھ اُسے گلے سے لگا کر پیار بھی کر چکا ہوں۔ خود ہی پوچھ پوچھ کر تھکا ہے تو آ کر میرے پاس بیٹھا ہے اور میں اُسے دیکھ دیکھ کر فدا اور قربان ہو رہا ہوں۔

ایک اور واقعہ اس سے ملتا جلتا بھی دیکھ لیں۔ باپ اپنے کاروبار کی وجہ سے بے حد مصروف تھا اور اس کے پاس وقت نہ تھا کہ وہ اپنے بچے کو دے سکے یا اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کر سکے۔ لیکن اس نے ہر وہ چیز اس کو لے کر دی جس کی اس نے خواہش کی۔ ایک دن بیٹے نے نا جانے کیا سوچا اور باپ کے پاس گیا۔ باپ اپنے کاروبار کی فائلیں کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ ''ابا جان ایک بات پوچھنی تھی؟'' بیٹے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اس کا باپ جواب کی جگہ ڈانٹ نہ دے۔

''میں بہت مصروف ہوں لیکن جلدی پوچھو کیا بات ہے؟'' باپ نے فائلوں سے نظر اٹھا کر ایک نظر بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

''ابا جان آپ اتنے مصروف رہتے ہیں۔ یقیناً آپ کا ہر لمحہ بہت قیمتی ہوگا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ آپ اگر کاروبار کے سلسلے میں کسی کو ایک گھنٹہ دیں تو اس کی کتنی قیمت لیں گے؟'' سوال چونکہ عجیب اور غیر متوقع تھا اس

لیے باپ نے کچھ دیر فائلوں سے نظر اٹھا کر پہلے سوچا اور پھر فخر سے کہا۔ ”ہاں میرا وقت واقعی بہت قیمتی ہے۔ میں اگر ایک گھنٹہ کسی کو دوں تو کم از کم ایک ہزار روپیہ لوں گا۔“

تو اباجان یہ ایک پانچ سو روپیہ کا نوٹ ہے جو آپ نے مجھے دیا تھا۔ یہ آپ لے لیں“ ”!!اور مجھے اپنا آدھا گھنٹہ دے دیں

یقینا ایسا سوال آپ کے بچے نے آپ سے نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ آپ یقینا بیدار ہو جاتے۔ لیکن سوچیں کہیں وہ آپ سے بات کرنا بھی پسند کرتا ہے یا نہیں اور اگر کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے تو تب تو معاملہ ہاتھ میں ہے لیکن اگر وہ آپ سے دور رہتا ہے یا آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ آپ کے گھر آنے پر وہ آپ سے دور رہتا ہے تو پھر ابھی سے فکر کریں اور اس سے بیٹھ کر باتیں کریں۔ روزانہ کوئی وقت مقرر کرکے اس کی دلچسپی کے موضوع پر گفتگو کریں۔ امید ہے ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ آپ باپ ہیں اور وہ آپ ہی کا بیٹا۔ محبت موجود ہے لیکن محبت کو راستہ آپ نے دینا ہے۔ عموماً بچوں کو وقت دینے یا پیار محبت میں مائیں کوتاہی نہیں برتیں لیکن ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں جو بچوں کی طرف دھیان نہیں دیتیں۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ باپ کی محبت میں کمی بچے کی شخصیت کو بگھاڑتی ہے لیکن ماں کی محبت میں کمی بچے کو مجرم اور نفسیاتی مریض بناتی ہے۔

آپ نے یہ واقعہ تو سنا ہوگا کہ ایک شخص نے اپنے باپ کی بیماری سے تنگ آ کر اسے ایک دن اٹھایا اور لے کر دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ جب وہ اسے پھینکنے لگا تو باپ نے کہا۔ بیٹے مجھے تھوڑا آگے کر کے پھینکو۔ بیٹے نے وجہ پوچھی تو باپ بولا کہ اس جگہ میں نے اپنے باپ کو پھینکا تھا۔

ایک ماں چار بچوں کو پالتی ہے لیکن چار بچے مل کر بھی ایک ماں کو نہیں پال سکتے۔ یہ سلسلہ اسی وقت رُکے گا جب آپ آئینہ دیکھیں گے۔ آیئے اپنے کل کی فکر چھوڑیں اور اپنے آج کو بہتر کریں۔ ہمارا آج ہی ہمارا کل ہے۔ اگر آج ہم نے بہتر کرلیا تو ہمارا کل خود بخود بہتر ہوجائے گا۔ اسی امید و دعا کے ساتھ کہ آئینہ دیکھتے رہیں گے اور برا نہیں مانیں گے۔

عمر بھر ہم یونہی غلطی کرتے رہے غالبؔ
دُھول چہرے پر تھی، ہم آئینہ صاف کرتے رہے

# ایسا نہیں کوئی!!

جب دنیا غموں اور دکھوں سے بھر گئی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے دنیا کے لیے ہمارے پیارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سراپا رحمت بنا کر بھیجا۔ آپؐ نے اپنے اخلاق اور کردار سے دنیا کے لیے ایسی مثالیں قائم کر دیں جن پر عمل کر کے ہم بھی اپنی دنیا کو جنت بنا سکیں۔

دنیا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی بار وحی اتری تو آپؐ بے حد گھبرائے اور سخت پریشانی کی حالت میں گھر تشریف لائے۔ آپؐ نے آتے ہی حضرت خدیجہ سے فرمایا ''مجھے کمبل اوڑھا دو۔'' اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے کردار پر جو گھر کی گواہی پیش کی وہ گواہی یہ تھی، آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، قرض داروں کے قرض کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، یتیموں پر شفقت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، مصیبتوں میں ''لوگوں کے کام آتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

آپؐ کی نرم مزاجی شفقت اور خدا کے بندوں کے ساتھ نرمی کا مظہر یہ بھی تھا کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر خندق کھودتے، ٹوکری اٹھاتے، اینٹیں ڈھوتے، لکڑیاں جمع کرتے اور کپڑے مرمت کرتے، خود دودھ دھو لیتے، بازار سے

سودا سلف لے آتے اور پڑوسیوں کے کام اکثر کر دیا کرتے تھے۔

خود قرآن نے آپؐ کے بارے میں گواہی دی ہے

اور بے شک (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔" (سورہ "
(القلم۔آیت ۴

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں

آپؐ کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، آپؐ برائی کے بدلہ میں برائی نہیں "
کرتے تھے، بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے، آپؐ کبھی کسی سے ذاتی
انتقام نہ لیتے، آپؐ نے کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپؐ نے کبھی کسی خادم کو
"نہیں مارا، آپؐ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی۔

آپؐ کا معمول تھا کہ آپ کسی سے ملتے تو پہلے خود سلام فرماتے اور مصافحہ میں جس
سے ہاتھ ملاتے کبھی پہلے خود ہاتھ نہ کھینچتے، آپؐ فرماتے

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہے۔" (مشکوۃ "
(ص: ۲۸۱،

حضرت انسؓ آپؐ کے خادم خاص روایت کرتے ہیں

میں دس سال تک حضورؐ کی خدمت میں رہا لیکن حضورؐ نے میری کسی بات پر کبھی "
(اف تک نہیں کہا۔" (متفق علیہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے مرتبہ میں کم وہ شخص ہوگا جس کی
(فحش گوئی اور بد زبانی کے ڈر سے لوگوں نے اس کو ملنا چھوڑ دیا ہو۔ (بخاری و مسلم
آپؐ بچوں کو دیکھ کر خوش ہوجاتے اور بچے بھی آپؐ سے بہت جلد مانوس ہوجاتے۔
جب آپؐ کھیلتے ہوئے بچوں میں سے گزرتے تو انہیں سلام کہتے، جب سواری پر گزرتے
تو پیار سے بچوں کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیتے، ایک اعرابی نے آپؐ کو بچوں کو پیار
کرتے دیکھا تو سخت حیران ہوا اور کہنے لگا ''میرے تو دس بچے ہیں اور میں نے تو ان سے
کبھی اس طرح پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا ''جب خدا نے تیرے دل سے شفقت
(ورحمت چھین لی ہے تو میں تھوڑا ہی اس کا ذمہ دار ہوں۔'' (صحیح بخاری، جلد ۸
آپؐ کی رحمت و شفقت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی بلکہ جانوروں پر بھی شفقت
فرمائی۔ آپؐ باغ سے گزر رہے تھے کہ ایک اونٹ زور زور سے بلبلایا، آپؐ نے اس
کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک کو بلا کر فرمایا ''اس جانور کے بارے
(میں خدا سے ڈرو۔'' (ابوداؤد
ایک بار ایک صحابی ابو مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے کہ آپؐ تشریف

لے آئے، آپؐ نے رنجیدہ ہو کر فرمایا۔
ابو مسعودؓ اس غلام پر تمہیں جس قدر اختیار ہے، اللہ عزوجل کو تم پر اس سے زیادہ''
''اختیار ہے۔
ابو مسعودؓ یہ بات سن کر خوف زدہ ہوگئے اور غلام کو آزاد کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا''ہر
حساس جاندار جس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اس کو کھلانے پلانے میں
ثواب ہے۔'' آپؐ نے مزید فرمایا کہ '' جو شخص نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا وہ
(سارے خیر سے محروم کیا گیا۔'' (مسلم
آپؐ فرماتے '' قیامت کے دن ان لوگوں کو پکار کر ان کا اجر دیا جائے گا جو دنیا میں
(لوگوں کی خطائیں معاف کر دیا کرتے تھے۔'' (ابوداؤد، ترمذی
رحمت اللعالمینؐ کی رحمت کی انتہا یہ ہے کہ آپؐ نے عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی
موت پر بھی، جس نے عمر بھر آپؐ کی مخالفت اور ایذا رسانی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا
تھا، اپنا کرتا اس کے کفن کے لیے مرحمت فرمایا اور اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور
فرمایا''اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ اس کی مغفرت کی دعا کروں تو
(میں اس سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کے لیے دعا کرتا۔'' ( صحیح بخاری۔ جلد ۲
فتح مکہ کا واقعہ دنیا کے عجیب اور حیرت انگیز واقعات میں سے ایک ہے۔ جن

دشمنان اسلام نے ۲۱ سال تک حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ مظالم کی کوئی انتہا نہ رکھی تھی۔ بھوک پیاس قید و بند، قتل و غارت، مار پیٹ اور تباہی و بربادی، گھروں سے اخراج اور پھر میدان جنگ میں ۹ سال تک شدید کشمکش اور خاک و خون میں تڑپنے کی دشمنیاں کی تھیں۔اب وہ مفتوح ہوگئے اور مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو آپ ﷺ نے جو بات اس وقت فرمائی وہ صرف آپؐ جیسی سراپا رحمت ہستی ہی کہہ سکتی تھی۔
(آپؐ نے فرمایا ''آج کا دن لطف و کرم اور رحمت کا دن ہے۔'' (بخاری جلد ۲
ابوسفیان کو بھی معاف کر دیا جس نے کفر و اسلام کی لڑائی میں کفر کی ساری جنگ اپنے ہاتھوں سے لڑی تھیں۔
عکرمہ بن ابو جہل کو بھی معاف کر دیا جس نے اسلام اور مسلمانوں پر کوئی ظلم نہ تھا جو ڈھایا نہ ہو۔ ہبار بھی معاف کر دیا گیا جس نے نیزہ مار کر رسول اکرمؐ کی پیاری بیٹی زینبؓ کو اونٹ سے گرا دیا تھا جس کے صدمے ہی سے بعد میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندہ جگر خوار حمزہ زوجہ ابوسفیان بھی معاف کی گئی جس نے میدان جنگ میں حضورؐ کے پیارے چچا امیر حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ وحشی بھی معافی لے گیا جس نے حضرت امیر حمزہؓ کو شہید کرکے گویا اس فوج کا مضبوط ستون گرا دیا تھا اور اپنے بے درد نیزے سے لشکر اسلام کا شیر

شہید کر دیا تھا۔ دنیا اس قسم کی فتح اور دشمن کے ساتھ اس قسم کے لطف و کرم سے پہلے بھی ناآشنا تھی اور ان کے بعد اب تک ناآشنا ہے۔

آپؐ فرمایا کرتے۔ ''تم ایک دوسرے کی باتیں مجھے نہ سنایا کرو، میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے میرا سینہ صاف ہو۔''

اب میری نگاہوں میں جچتا نہیں کوئی
جیسے میرے سرکار ہیں ایسا نہیں کوئی

☆.....☆

# مچھروں کی حکومت

باوثوق ذرائع سے خبر ملی ہے کہ مچھروں کی تعداد میں بے حساب اضافہ ہو گیا ہے اور اب شہر میں مچھروں نے بھاری اکثریت حاصل کر لی ہے۔ ان کے ناپاک ارادوں سے ہر خاص و عام واقف ہے لیکن پھر بھی کسی کو جرات نہیں ہو رہی کہ ان کے خلاف آپریشن کلین اپ کر کے ان کا قلع قمع کر سکے۔ شہر میں موجود گندگی کے ڈھیر، گٹروں سے ابلتے چشمے ان کی بہترین پناہ گاہیں ثابت ہو رہے ہیں جہاں یہ اپنی افزائش کر کے روز بروز اپنی قوت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اگر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو آج روکنے کی تدبیر نہیں کی گئی تو وہ دن دور نہیں جب شہر میں مچھروں کا ہی راج ہوگا اور انسان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔

مچھروں سے آئے روز مذاکرات کیے جاتے ہیں لیکن بات شوں شوں سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چینی زبان بولتے ہیں اس لیے ان سے مذاکرات کیلئے چینیوں کی خدمات حاصل کی جائیں لیکن کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ مچھروں پر برطانیہ میں اچھی تحقیق ہو رہی ہے۔ اس لیے ان سے مدد حاصل کی جائے۔ لیکن باجود کوششوں کے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مچھر ہماری

بات نہیں سنتے یا ہم مچھروں کی نہیں سنتے۔

پہلے کے مچھروں میں اور موجودہ مچھروں کی جنریشن میں یہ فرق ہے کہ پہلے کے مچھر صرف رات میں کاٹتے تھے لیکن ینگ جنریشن دن دیکھتی ہے نہ رات۔انسانوں کو دیکھ کر انہوں نے بھی چوبیس گھنٹے سروس شروع کر رکھی ہے۔کاش یہ مچھر انسانوں کو دیکھ کر ہڑتال بھی شروع کر دیتے تو کتنا اچھا دن یا رات گزرتی کہ آج ناغہ ہے۔مچھروں کے کاٹنے پر شاید کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو اگر یہ مچھر کاٹنے کا کام علی الاعلان نہ کریں اور ہمارے کانوں میں بیں بیں نہ کریں۔اب انہیں کیا پتا کہ بھینس کے آگے بین بجائیں تو شاید وہ سن بھی لے لیکن انسانوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مچھروں کی آئے روز نئی نئی قسمیں دریافت ہو رہی ہیں۔کوئی بھینگی ہے تو کوئی ڈینگی ہے۔کوئی صاف پانی کا ہے تو کوئی گندے پانی کا۔اگر ان کی قسمیں اسی طرح روز روز دریافت ہوتی رہیں تو وہ دن دور نہیں جب ہم ہر مچھر کا الگ الگ نام رکھ دیں گے۔مثلاً ڈینگی مچھر، کن کٹا مچھر، پر کٹا مچھر، دیسی مچھر، ولایتی مچھر، کالا مچھر، مچھر خان وغیرہ وغیرہ۔ان کو کوئی بھی نام دے دیں بہرحال ان کی ذات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔جن کی فطرت میں کاٹنا لکھا ہو وہ تو کاٹے بنا نہیں رہتے۔مچھروں کی یہی بات ہمیں اچھی لگتی ہے کہ یہ اپنا کام

بڑی ایمانداری سے بلا تفریق کرتے ہیں۔

مچھروں پر جس قدر تحقیق ہو رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والا مستقبل مچھروں کا ہی ہوگا۔اسی لیے ان کے نام پر کراچی میں ایک کالونی کا نام ''مچھر کالونی'' رکھ گیا۔اب پتا نہیں یہ انسانوں کی کالونی ہے یا مچھر کی کالونی ہے۔کراچی کی کالونی ملیر کو بھی مچھر نے خوب عزت بخشی ہے۔اب پتا نہیں ملیر میں رہنے والے مچھر نے ملیریا پیدا کیا تھا کہ ملیریا نے ملیر کو جنم دیا ہے۔یہ تو تحقیق طلب بات ہے جس پر انسانوں نے تو شاید تحقیق نہیں کی لیکن مجھے یقین ہے مچھروں میں اس پر تحقیق ضرور ہو رہی ہوگی۔

ہمیں یہ بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن امریکی سائنسدانوں نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ مستقبل مچھروں کا ہے اسی لیے انہوں نے مچھروں جیسے ڈرونز بنانا شروع کر دیئے ہیں۔امریکی سنڈی اور کتوں کے بعد اب امریکی مچھر بھی مارکیٹ میں آنے والے ہیں۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی انسانوں پر کم ہی بھروسہ کرتے ہیں اسی لیے وہ سنڈی، کتے اور مچھروں کو استعمال کرتے ہیں۔کیونکہ انسان دھوکہ دے جاتے ہیں وہ کہتے تو یہ ہیں کہ وہ ڈرتے ورتے کسی سے نہیں لیکن ایک معمولی مچھر سے بھی ڈر کر مچھر دانیوں میں پناہ لے لیتے ہیں۔

آج کل ڈینگی مچھر کے بڑے چرچے ہیں اور اس نے بڑی دہشت پھیلا رکھی ہے۔یقینا اس کا تعلق گوجرانوالہ کے ڈینگا سے ہوگا یا اس کی ڈینگیوں نے اس کو مشہور کیا ہوگا۔پتا نہیں یہ مچھر ہمارے خون کے اتنے پیاسے کیوں ہو گئے ہیں جبکہ ہم ان نے ان کے آرام و سکون میں کبھی کوئی خلل نہیں ڈالا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے لیے اچھا ماحول رکھا ہے۔ لیکن لگتا ہے انہوں نے سیاستدانوں کا خون چوس لیا ہے تبھی اب ان کا کسی طرح پیٹ نہیں بھرتا۔ اب انہیں کیا پتا کہ سیاستدان اور مچھر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سیاستدان کا خون چوس کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کی رگوں میں بھی سیاستدان کا خون دوڑ رہا ہے یا یوں کہہ لیں کہ سیاستدان کا خون پی کر کوئی سیاستدان نہیں بن سکتا۔

آج کل مچھروں کا یہ نعرے بڑے مقبول عام ہو رہا ہے اور ہر مچھر کی زبان زد عام پر سنا جاسکتا ہے۔

!! تم کتنے مچھر مارو گے..... ہر گھر سے مچھر نکلے گا

!! کل بھی مچھر زندہ تھا..... آج بھی مچھر زندہ ہے

!! مچھر تیرے جانثار.....بے شمار بے شمار

!! انسانوں کا جو یار ہے..... غدار ہے غدار ہے

!! گو انسان گو، یا پھر رو انسان رو

اسی تناظر میں میری آپ سے بھی یہ درخواست ہے کہ مچھروں سے دشمنی کرنا چھوڑ دیں مچھروں کے مینڈیٹ کو دل سے تسلیم کرلیں کیونکہ آئندہ حکومت مچھروں کی ہی ہوگی۔ جس میں انصاف سب کے ساتھ ہوگا۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوگا۔ کسی مچھر کے آنے پر سائرن نہیں بجایا جائے گا۔ سستا خون سب کو دستیاب ہوگا۔جب چاہیں ایئری مچھر سرنج کے ذریعے ڈرپ لگوائیں بغیر کسی اضافی چارجز کے۔اس کے لیے کسی بھی مچھر فرنچائز پر بھی جانے کی ضرورت نہیں۔

کسی کو مچھروں کے بارے میں خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جب مچھروں نے نمرود جیسوں کو نہیں چھوڑا اور اس کے ناک میں دم کرکے جان لے لی تھی تو وہ آج بھی یہ کام باآسانی کر سکتے ہیں۔اس لیے میں تو کہتا ہوں مچھروں کو مارنے کے بجائے مچھروں سے دوستی کرلیں اور ان کے ساتھ امن و شانتی سے رہنا سیکھ لیں ورنہ !! پھر نہ کہنا کہ خبر نہ ہوئی

☆.....☆

# زندگی کیا ہے؟

پانچ چھ فٹ کا انسان کہ جس کی زندگی خود اس کے اختیار میں نہیں..... جو خود اپنی مرضی سے وجود میں نہیں آیا اور نہ اپنی مرضی سے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے..... جس کی اگر سانس رک جائے تو وہ اسے بحال نہیں رکھ سکتا..... لیکن یہی پانچ چھ فٹ کا انسان کہیں خدائی کا دعویدار بن کر کھڑا ہے تو کہیں جانور سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔ بظاہر اس کا کوئی دشمن نہیں لیکن یہ خود اپنا بہت بڑا دشمن ہے۔ چاند پر قدم رکھ کر کائنات کی کھوج کرنے والا انسان آج خود اپنے دل میں چھپے خدا سے بھی محروم ہے۔ اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ اور کیوں پیدا کیا ہے؟ جب دنیا کا کوئی کارخانہ خود بخود وجود میں نہیں آتا تو اتنی بڑی دنیا کا کارخانہ کیسے وجود میں آگیا ہے اور صرف یہی نہیں کہ وجود میں آگیا ہے بلکہ مستقل مزاجی سے چل رہا ہے۔ یہ سورج جو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹ جائے تو کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے اپنی جگہ پر لا سکے۔ یہ آسمان جس کی بلندیوں کو ہماری آنکھیں روز دیکھتی ہیں جو حد نگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ کوئی اسے آج تک چھونا تو درکنار اس کا احاطہ بھی نہیں کر سکا۔ اسی آسمان پر پھیلے یہ ان گنت ستارے جو ہمارے سورج سے

بھی کئی گنا بڑے ہیں ، لیکن اپنی حقیقت روز آسمان پر ہمارے سامنے عیاں کرتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کہ ایسی کئی کہکشائیں ہیں جہاں پہنچنے کے لیے ہم وقت کی قید میں ہیں۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس جیسی کتنی ہی حقیقتیں ہیں جو ہمارے آس پاس بکھری ہوئی ہیں لیکن ہماری عقل ماؤف ہے اور نظر خیرہ ۔ دیکھنے والوں کو آسمان کی طرح سب کچھ نظر آ رہا ہے لیکن نہ دیکھنے والے آسمان کی تلاش میں نکل کر بھی آسمان تک نہیں پہنچ پائے۔ ہمارے پاس سوچنے اور سمجھنے کیلئے بہت وقت ہے لیکن ہم سوچنے کیلئے قطعاً تیار نہیں ۔ یہی سوچ کا جمود انسان کو جانوروں سے مشابہہ کر رہا ہے۔

ہماری زندگی کی گھڑی الٹی گنتی چل رہی ہے اور زندگی برف کی مانند پگھلتی جا رہی ہے۔ ظاہر کو ہی سب کچھ سمجھنے والے اسی زندگی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔اگر یہی سب کچھ زندگی ہے اور موت کے بعد کچھ نہیں تو بہت اچھا رہا وہ جس نے دنیا کی مال و متاع کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کیا۔ لیکن اگر ایسا نہیں جیسا کہ نظر بھی آتا ہے تو پھر کیا بنے گا اس انسان کا جس نے

اپنا سارا وقت ضائع کر دیا۔ انسانی عقل کہتی ہے کہ خدا کے مان لینے میں کوئی نقصان نہیں لیکن نہ ماننے میں سراسر نقصان ہے۔

اگر خدا کو مان لیا جائے تو پھر اس کی خدائی بھی خود بخود نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔یقیناً جب اس نے پیدا کیا ہے تو کوئی نہ کوئی مقصد بھی رہا ہوگا۔ میں یہ بات کیسے مان لوں کہ جب دنیا میں کوئی چیز بھی بغیر کسی مقصد کے نہیں تو ہم بے مقصد ہی دنیا میں آئے ہوئے ہیں۔ سورج، چاند، ستارے اور اس دنیا کا ذرہ ذرہ اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ قدرت کے اس کارخانہ میں اگر غور کریں تو کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کارخانہ کو بگاڑنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اگر کوئی اس کارخانہ میں بناؤ بگاڑ کا سبب بن رہا ہے تو وہ یہی انسان ہے۔ ہر جاندار و بے جان اپنے اپنے دائرہ میں قید ہے۔ شیر شکار کرتا ہے تو صرف ایک جانور کا اور اپنی بھوک مٹانے کے بعد بلاوجہ کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ اسی طرح ہر جاندار اپنے اپنے دائرہ میں اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ آج تک ہمارے مشاہدہ میں ایسی کوئی بات نہیں آئی کہ کسی جاندار مثلاً کوے نے پائپ سے پانی پینا شروع کر دیا ہو۔ مچھلیوں نے پانی سے نکل کر زمین پر بھی رہنا شروع کر دیا ہو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ بات مشاہدہ میں ہے کہ انسان نے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کئی انسانوں کو شکار کر لیا ہو۔ انسان نے ہوا میں اڑنا اور پانی کے اندر جانا شروع کر دیا۔ اس کے

پیدا کردہ دھوئیں سے ماحول میں تبدیلی واقع ہونے لگی۔

انسان کے پاس یہ اختیار کس قدر ہے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔ کیا دنیا بنانے والے کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ اپنی دنیا کی حفاظت کرے۔ بظاہر تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اسے کوئی پرواہ نہیں ہے جو چاہے کوئی کرتا پھرے۔ لیکن اگر سوچیں تو پھر یہ آزادی کچھ محدود سی دکھائی دینے لگتی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب کوئی قوم یا انسان دنیا کے وجود کیلئے خطرہ بنا اس خدا کا قانون حرکت میں آیا اور کئی نمرود، ہٹلر اور چنگیز خان کھوپڑی کے انبار لگانے کے بعد تاریخ سے اس طرح ختم ہوگئے کہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

اب اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ رب العالمین انسانوں سے بے انتہا محبت کرتا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی کا اس دنیا کو ختم کر دیتا۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے اور پھر اس کو غلط بات پر سرزش بھی کرتی ہے اسی طرح وہ پیدا کرنے والا خدا ستر ماؤں سے زیادہ بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ بے لوث اور بے غرض محبت !! وہ بھی کبھی کبھی ہماری سرزش کرتا ہے کہ ہم صراط مستقیم پر آجائیں ۔ لیکن ہم بگڑے ہوئے بچے کی طرح اپنے دنیا کے کھلونوں میں کچھ اس قدر گم ہوجاتے ہیں کہ اس خالق سے اس قدر غافل ہوجاتے ہیں کہ جیسے خود ہی پل بڑھ کر اتنے بڑے ہوگئے ہیں۔ پھر جب وہ

خالق اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے کبھی ہمارے ہاتھ سے ہمارے کسی عزیز (کھلونے) کو چھین لیتا ہے تو ہم گڑگڑا کر اس سے شکوہ کرنے لگتے ہیں۔ اس پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا ۔لیکن پھر بھی اس نے کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑا..... وہ ہماری طرف متوجہ ہے لیکن کوئی اسے پکارے تو سہی۔

کبھی وقت ملے تو تنہائی میں ایک بار..... صرف ایک بار اسے سچے دل سے پکار کر تو دیکھئے ..... پھر بتایئے گا کہ خدا ہے کہ نہیں؟.....پھر وہ بتائے گا زندگی کیا ہے.....؟؟

☆.....☆

# وہ ریت ابھی تک باقی ہے

لاکھوں کروڑوں درود پاک آپؐ کی ذات اقدس پر جس کے صدقے ہمیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ آپؐ کی شان میں گستاخی کرنے والا واجب القتل ہے اس پر تمام عالم اسلام کا متفقہ اجماع ہے۔ پھر یہ قانون صرف اسلام میں ہی نہیں بلکہ دیگر مذاہب میں بھی موجود ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہنے والا عیسائیت میں بھی واجب القتل ہے اور اس کا اطلاق امریکہ کے قانون میں بھی موجود ہے۔ پھر ناموس رسالتؐ کو کالا قانون کہنا یہ صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہی ممکن تھا جہاں ہر شخص خود کو مفتی اعظم سمجھ کر فتویٰ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جس کو دین کی الف ب بھی نہ آتی ہو وہ بھی دین کا ٹھیکیدار بن سکتا ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اس قانون کی زد میں آنے والا کوئی بھی شخص آج تک سزائے موت تک پہنچ کر جہنم واصل نہیں ہوا۔ انسانیت کے چمپئن اس قانون پر عمل درآمد کروانے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں لیکن ایسے وقت میں جب کہ ربیع الاوّل کی آمد ہوئی ممتاز قادری کی سزائے موت کا پروانہ ایسی سپریم کورٹ سے جاری ہوا ہے جو سود کے مطابق کہتی ہے کہ جس نے سود نہیں لینا وہ نہ لے اور جو سود لیتا ہے اس سے اللہ پوچھے گا۔ بے شک اللہ آپ سے ہی نہیں ہم سے بھی پوچھے

گا کہ کون کون اللہ کے خلاف جنگ میں شریک مجرم رہا ہے۔

قانون اندھا ہی نہیں ہوتا بلکہ احساس سے بھی عاری ہوتا ہے اس کا اندازہ ہمیں ہے لیکن قانون ہی کی کتابوں میں کہیں پڑھا تھا کہ سیلف ڈیفنس میں قتل کرنے والا مجرم نہیں ہوتا۔ آپ کے ماں باپ کو کوئی گالی دے اور آپ خاموش رہیں یہ تو شاید ممکن ہے لیکن ہمارے آقا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کو سزائے موت کے قانون کا کالا قانون کہنا کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب و پیارا نہ ہو جاؤں۔" (بخاری، کتاب الایمان)

ناموس رسالتؐ کے قانون پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے آج یہ دن آگیا ہے کہ ہر شخص اس قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس پر عمل درآمد کر رہا ہے۔ جس کو کسی بھی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن سوچنے کی بات ہے کہ جب قانون کی رٹ قائم نہیں ہوگی تو لوگ تو قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے اور ویسے بھی قانون اپنے فیصلوں کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں کھلونا بن کر رہ گیا

ہے۔ ایک طرف سینکڑوں لوگوں کو سرعام بے جرم میں قتل کرنے والے اپنے انجام کے منتظر بیٹھے ہیں اور دوسری طرف ممتاز قادری جیسے لوگ۔ جن پر قانون کے سارے اصول لاگو ہوتے ہیں۔

انگریزوں کے دور میں یہی غلطی ایک کوچوان غازی علم دین نے کی تھی جس کا مقدمہ قائد اعظم نے لڑا تھا۔ لیکن اسے بھی اس وقت کے قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی تھی۔ آج قائد اعظم کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انہی انگریزوں کے قانون کے مطابق سزا دی جائے گی۔

اب ممتاز قادری کی سزائے موت پر عمل درآمد رکوانے کا صرف ایک ہی دروازہ رہ گیا ہے اور وہ ایسے صدر مملکت کے پاس جاتا ہے جو سود میں بھی رعایت کے قائل ہیں ۔لیکن س معاملہ میں بلا رعایت کیسے دی جا سکتی ہے۔ ممتاز قادری کو سزائے موت دی جائے تاکہ آئندہ کسی کو ہمت نہ ہو کہ وہ اپنی محبت کا عملی دعویٰ کر سکے۔

وہ ریت ابھی تک باقی ہے۔۔۔۔ یہ رسم ابھی تک جاری ہے
کچھ اہلِ ستم، کچھ اہلِ حشم مے خانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ دیا۔۔۔ دیکھا کہ یہ پتھر بھاری ہے
جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل

اُس وقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ ہیبت جاری ہے
کس زعم میں تھے اپنے دشمن؟ شاید یہ انہیں معلوم نہیں
یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی۔۔۔۔ اور جان تو سب کو پیاری ہے

# زندہ سیاستدان، مردہ عوام

''بہت دن ہوئے آپ دکھائی نہیں دے رہے، کہاں غائب ہیں؟''

'' اللہ کا شکر ہے کہ میں ابھی مسنگ پرسنز (missing persons) میں شامل نہیں ہوا، لیکن ہوں تو عوام ہی دکھائی کیسے دوں گا آپ کو؟''

''مجھے لگا کہ آپ بھی الیکشن جیت گئے ہیں اسی لیے غائب ہیں۔''

''الیکشن لڑنے والے جیتیں یا ہاریں دونوں صورتوں میں پھر دکھائی نہیں دیتے۔''

''جیت کر تو سمجھ میں آتا ہے کہ اب کام کرنے ہوں گے اس لیے غائب ہوتے ہیں لیکن ہار کر کیوں غائب ہو جاتے ہیں؟''

''وہ اس لیے کہ انہوں نے جو اخراجات کیے ہیں اب وہ کون بھرے گا۔ جیت جاتے تو عوام سے سود سمیت نکلوا لیتے لیکن اب ہار کر عوام کو کیا منہ دکھائیں۔''

'' عمران خان نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ سال الیکشن کا سال ہوگا۔ ابھی تک ملک میں الیکشن کہیں نہ کہیں ہو ہی رہے ہیں۔''

'' وہ ملکی انتخابات کو شفاف نہیں مانتے لیکن انٹرا پارٹی الیکشن ضرور شفاف کروائیں گے۔''

'' اس طرح نواز شریف صاحب نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ 2018 تک بجلی نہیں جائے

''گی۔ کیونکہ بجلی ہوگی تو جائے گی ناں۔
سیاستدان بھی کبھی بھلا غلط کہہ سکتے ہیں۔ غلط تو عوام کہتے ہیں فلاں زندہ ہے، اور ''
'' فلاں زندہ باد۔
''اسی لیے سیاستدان زندہ ہیں اور عوام مردہ ہے۔''
سنا ہے آئندہ تین سال میں بیس لاکھ خاندانوں کو چالیس ارب کے بلاسود قرضے دیئے''
''جارہے ہیں۔
''سنی سنائی باتوں پر زیادہ کان مت دھرا کرو۔''
ملک کو قرضوں پر چلانے والے عوام کو بھی قرضوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ بھلا اس ''
''طرح بھی کوئی ترقی کرتا ہے؟
ویسے میں نے آج تک محلّہ میں کسی غریب کو قرضہ لے کر ترقی کرتے نہیں ''
''دیکھا۔ترقی ہمیشہ اپنی چادر کے اندر پاؤں رکھ کر ہی ہوتی ہے۔
''بہرحال اس طرح ملک میں ترقی ہو نہ ہو لیکن ووٹ میں ترقی ضرور ہوجائے گی۔''
قرض سے یاد آیا طاہر القادری صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ شہداء کا خون قرض ہے''
''اور وہ بدلہ لیے بغیر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔
اسی لیے وہ اب آگے نہیں بڑھ رہے کہ بادل نخواستہ دھرنے کی طرح پیچھے نہ ہٹنا پڑ ''
''جائے۔
ویسے انہیں کہا کس نے تھا کہ وہ قرضہ دیں جب پتا بھی ہے کہ قرضہ واپس کرنے کے''
'' لیے نہیں ہوتا۔

یہی بات تو زرداری صاحب بھی ایک عرصہ سے سمجھا رہے ہیں۔ لیکن ان کی کسی نے ''
''نہیں سنی اسی لیے وہ دل برداشتہ ہو کر ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔
جب سے یہ غائب ہوئے ہیں ان کے خلاف اثاثہ جات ریفرنس کا عدالتی ریکارڈ بھی ''
''غائب ہو گیا ہے۔
لگتا ہے جاتے ہوئے اثاثہ جات لے کر جانے تھے لیکن وہ غلطی سے عدالتی اثاثہ جات کا ''
''ریکارڈ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔
اسی لیے تو ان کا فرمانا ہے کہ وہ کسی فرد یا ادارے کو زبردستی اقتدار پر قبضہ نہیں ''
''کرنے دیں گے۔
تو پھر کیا طشت میں رکھ کر پیش کریں گے جس طرح انہیں بے نظیر کی شہادت کے بعد ''
''!!ملا ہے
اقتدار چیز ہی ایسی ہے اس پر جو بھی آتا ہے قابض ہو جاتا ہے۔ پھر ہٹنے کا نام ہی نہیں ''
''لیتا۔
''یہ آخر قبضہ مافیا سے ہماری جان کب چھوٹے گی؟''
جب عوام جاگے گی لیکن جہاں مرنے والے سیاستدان زندہ ہو جائیں وہاں عوام مردہ ''
''ہو جاتی ہے۔

☆.....☆

# بولنے والا موبائل

جن لوگوں نے نوکیا موبائل استعمال کیا ہو وہ جانتے ہیں کہ یہ وہ پہلی کمپنی ہے جس نے پاکستان میں سب سے پہلے پائیدار، مضبوط اور دیر پا چلنے والے موبائل سیٹ متعارف کروائے جن کی آج بھی مارکیٹ میں ری سیل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی موبائل سیٹ کمپنیوں کی پاکستان میں آمد ہوئی جنہوں نے جدید اور سستے موبائل متعارف کروانے شروع کیے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں موجود فیچرز جیسے ٹچ موبائل، ریڈیو، ٹارچ، ایک سے زیادہ سم لگانے کی سہولت وغیرہ بیک وقت موجود تھیں۔ پھر اس پر مزید یہ نہایت سستے داموں مارکیٹ میں نظر آنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب موبائل ہاتھ میں لے کر چلنا ایک اسٹیس کو کا حصہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ موبائل سیٹ بہت مہنگے اور عوام کی پہنچ سے دور تھے۔

پھر وقت نے یہ رجحان بدلا اور موبائل پاکستانی عوام کے ہاتھ آگیا۔ اس کے ساتھ بھی عوام نے وہی سلوک کیا جو ہر نئی آنے والی ٹیکنالوجی کے ساتھ پاکستانی عوام کرتی ہے۔ موبائل سیٹ اتنے عام ہوئے کہ اب گدھا گاڑی والے سے لے کر ایک فقیر کے پاس بھی موبائل آگیا۔ آج بھی اگر آپ کسی جھونپڑپٹی کی طرف چلے جائیں تو وہاں آپ کو لوگ ننگے بھوکے نظر آئیں گے لیکن ان کے ٹوٹے

چھوٹے گھروں کے اوپر ڈش ، کیبل اور موبائل ضرور ملے گا۔ شاید یہ وہ چیزیں کہ جن کے بغیر دنیا میں گزارا نہیں ہوتا۔

موبائل کے عوام کے ہاتھ آنے سے گویا عوام کو گویائی مل گئی۔ جسے دیکھو موبائل پر کسی نہ کسی سے بات میں مصروف نظر آئے گا۔ کوئی راہ چلتے موبائل پر بات کرتے ہوئے چلتا دکھائی دے گا تو کوئی گاڑی چلاتے ہوئے کانوں سے موبائل یا ہینڈ فری لگائے دکھائی دے گا۔ کوئی راہ چلتے موبائل سے سلفیاں اتار رہا ہے تو کوئی موبائل پر ٹیکسٹ میسجز کرنے میں مصروف ہے۔

وقت نے گویا سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ لوگ جو ملنے کے لیے دور دراز سے ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے ، اب موبائل پر بات کرکے وقت بچالیتے ہیں۔ اپنوں سے جڑے لوگ گھر کے اپنوں سے بھی دور چلے گئے ہیں۔ ناشتہ کی میز پر بیٹھا بچہ اپنے والد کو دیکھ رہا ہے جو ناشتہ کے ساتھ ساتھ موبائل سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اسکول میں بچے پڑھنے کے بجائے موبائل سے استفادہ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر سکیں۔ لکھنے پڑھنے کا رجحان تو پہلے بھی نہیں تھا اور موبائل نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور ایک ایسی زبان متعارف کروا دی جسے پتا نہیں کیوں رومن اردو کا لقب دے دیا گیا۔ خط لکھنے کا رواج گویا ختم ہو

کر رہ گیا اور پھر جواب کا انتظار۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ پہلے گھڑی ختم ہوئی پھر ریڈیو ختم ہوا، پھر ٹارچ ختم ہوئی اور اب کیمرے بھی مارکیٹ سے غائب ہو رہے ہیں۔

آج اگر صحیح معنوں میں کوئی کمپنی پاکستان میں بزنس کر رہی ہے تو وہ یہی موبائل کمپنیاں ہیں جن کے اشتہارت سے ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ موبائل ہی ہے۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ جیسے جیسے موبائل کے کسٹمرز میں بے حساب اضافہ ہوا ہے اسی قدر موبائل کے سیٹ اور ان کی کوالٹی میں بھی فرق آیا ہے۔ لوگ ایک سیٹ ایک سال وارنٹی میں رکھ کر وارنٹی ختم ہونے سے پہلے فروخت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے ان کو شاید اچھی قیمت نہ ملتی ہو لیکن پاکستانی عوام تبدیلی چاہتے ہیں۔ چاہے وہ موبائل ہی کی تبدیلی کیوں نہ ہو۔ استعمال کرو اور پھینکو کی پالیسی نے پاکستانی عوام کے نفسیاتی رجحان میں بھی تبدیلی پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے دوستی کرکے نبھانے کے بجائے استعمال کرکے بھول جاتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں۔

میں ذاتی طور پر خریدتے وقت پرانی چیزوں کو نہ صرف پسند کرتا ہوں بلکہ پائیدار اور مضبوطی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ یہی سوچ کر نوکیا کا ایک

موبائل سیٹ خریدا تھا کہ جس میں شاید وہ سب فیچرز نہیں تھے جو ایک اچھے موبائل کی پہچان سمجھے جا سکتے ہوں۔ لیکن پچھلے دنوں یہ موبائل بھی چھ ماہ بعد ہی دھوکہ دے گیا۔ میں نے موبائل کا وارنٹی کارڈ نکالا اور اس پر دیئے گئے کسٹمر کیئر سینٹر گلشن اقبال برانچ جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ اسے یہاں سے بند ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے اور اب ان کا صرف ایک ہی آفس ہے جو عبداللہ ہارون روڈ پر واقع ہے۔ ایک بار غلطی کرنے کے بعد دوبارہ غلطی کرنا کچھ مناسب نہ تھا اس لیے پہلے گوگل کے نقشہ پر اسے تلاش کرکے اس بات کو یقینی بنایا کہ اب یہ غلطی نہ ہونے پائے۔ لیکن جب یہاں پہنچے تو پتا چلا کہ یہاں سے تھوڑا دور عمہ ٹاور، فاطمہ جناح روڈ پر شفٹ ہوگیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہاں پہنچے تو یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ میرے موبائل میں ایک دلچسپ فیچر ہے جس سے میں اس سے قبل واقف نہ تھا اور وہ یہ کہ موبائل بولتا بھی ہے۔ خراب ہونے والے موبائل نے بتایا کہ اس میں پانی گیا ہے۔ اس سے قبل ٹیکنیشن نے سیٹ دیکھتے ہی بتادیا تھا کہ یہ کہیں گرا ہے۔ اس لیے وارنٹی کلیم نہیں ہوسکتی۔ میں یہاں سے نامراد لوٹنے والا اکیلا شخص نہ تھا بلکہ اس سے قبل بھی میرے سامنے کئی حضرات لڑتے جھگڑتے جا چکے تھے۔ یہ ایسا سانحہ پہلی بار نہیں ہوا بلکہ کئی بار میرا سابقہ دوسری موبائل کمپنیوں کے ساتھ بھی پیش آ چکا ہے۔ وانٹی دینا ایک بات ہے اور اسے نبھانا دوسری بات۔

یہ واقعہ سنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میرا سیٹ تو سستا سا تھا جسے میں ٹھیک کروالوں گا لیکن موبائل سیٹ کمپنیوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہیں اگر وہ اشتہارات کے بجائے کسٹمرز پر تھوڑا پیسہ خرچ کردیں تو شاید ایک بار کسٹمر بننے والے کسی دوسرے کے پاس کبھی نہ جائیں اور اگر آپ نے وارنٹی کو نبھانا نہیں ہے تو برائے کرم اس طرح لوگوں کو خوار نہ کریں۔ موبائل کے ساتھ دیئے گئے وارنٹی کارڈ پر دیئے گئے تمام پتے اور نمبرز غلط شائع کرنے کا مطلب یہی ہے کہ آپ کس قدر کسٹمرز کے ساتھ سنجیدہ ہیں۔آج میں نے آپ کے سامنے موبائل کا وہ فیچر رکھا ہے جس سے آپ اس وقت واقف ہوں گے جب آپ کا موبائل وارنٹی کے اندر خراب ہوگا۔یہ بات حقیقت ہے کہ جب تعداد بڑھ جائے تو معیار میں فرق آ ہی جاتا ہے۔ اور ویسے بھی ہم معیار کے نہیں تعداد کے قائل ہیں!!

# جنگل میں دنگل

ایک جنگل میں گیدڑ کی حکومت تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں شیر نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگل میں جمہوریت تھی اور جمہوریت میں جس کی اکثریت ہو حکومت اسی کی ہوتی ہے۔ اب چونکہ جنگل میں ہر طرف گیدڑ ہی گیدڑ تھے اس لیے ان کا ہی راج تھا۔

جنگل میں جمہوریت تو تھی لیکن قانون جنگل کا ہی تھا یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اب جس کا جہاں زور چلتا وہ اپنا منھ مارنے سے باز نہیں آتا تھا۔ گیدڑ چونکہ طاقتور نہیں تھا اس لیے کوئی ان کی سنتا بھی نہیں تھا۔ گیدڑ کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی اس کی سنتا ہے یا نہیں سنتا۔ وہ تو بس اسی میں خوش تھا کہ وہ جنگل کا لیڈر ہے۔

جنگل میں ہر طرف ایک افراتفری مچی رہتی تھی۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں رہتا لیکن اس کے باوجود کسی کی جان محفوظ نہیں تھی۔ جہاں کسی جنگلی جانور کا دل چاہتا وہ اپنی بھوک مٹانے میں ذرا برابر دیر نہ کرتا۔ شریف جانور اس بات کی شکایت لے کر روز گیدڑ کے دربار میں رونق افروز ہوتے لیکن وہاں ان کا سامنا لومڑیوں اور بھیڑیوں سے پیش آتا۔ جو انہیں دیکھ کر اپنی

رال ٹپکانے لگتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ پتا نہیں کہاں سے کوئی گدھا بھولا بھٹکا اس جنگل میں آ پہنچا۔ جنگل کا ماحول دیکھ کر پہلے تو وہ سٹپٹایا پھر گویا اس کی سمجھ میں کچھ انوکھا آیا۔ اتنا شور مچایا کہ پورے جنگل کے جانور اس کے پاس جمع ہوگئے اور اس سے شور کی وجہ پوچھنے لگے۔

میں جنگل کے راج کو چیلنج کرتا ہوں۔ یہاں ظلم ہو رہا ہے۔ میں اسے تبدیل کروں" گا۔ آپ سب میرا ساتھ دیں۔" گدھے کی زوردار تقریر سن کر کچھ جانور گدھے کے ساتھ ہو لیے۔ ان جانوروں میں اکثریت گھاس کھانے والوں کی تھی اور دوسری طرف گوشت خور گیدڑ کے ساتھ رہے۔ گویا اب جنگل میں گیدڑ کے مقابلہ میں گدھے آ گئے۔

گیدڑ کو اپنی حکومت ختم ہوتی دکھائی دینے لگی تو اسے فکر ہوئی۔ اس نے فوراً اپنی کابینہ بلائی اور اس پر غور ہونے لگا کہ کس طرح گدھے کی آواز کو دبایا جائے۔ چیتے نے کہا کہ وہ اس کی گردن مروڑ دے گا۔ لیکن لومڑی بولی اس طرح تو وہ جنگل کا ہیرو بن جائے گا اور جو اس کے ساتھ نہیں وہ بھی اس کی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔ کچھ ایسا کرو کہ وہ مظلوم بھی نہ بنے اور اس کا کام بھی تمام ہو جائے۔ سبھی اس مسئلہ پر سر جوڑے بیٹھے رہے۔ کسی نے کچھ تجویز

دی تو کسی نے کچھ لیکن کسی بھی تجویز پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ آخر تنگ آ کر گیدڑ نے محفل برخواست کر دی۔ گیدڑ کو ایسا لگ رہا تھا کہ گدھے کے پیچھے ضرور کسی کا ہاتھ ہے اس لیے اس نے سوچا کہ پہلے دھمکیاں دے کر دیکھا جائے پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔

دوسری طرف گدھا گیدڑ بھبکیوں سے بے پروا جگہ جگہ جوش خطابت دینے میں مصروف تھا۔ اسے جو بھی ملتا وہ اسے اپنی پارٹی میں شامل کر لیتا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ یہ تو خود ظالم ہے۔ گدھے کے شور نے بہت جلد ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ گیدڑ کی گرتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر کچھ جنگلی جانور بھی اس کو چھوڑ کر گدھے کے کیمپ میں شامل ہو گئے تھے۔

شیر اپنی کچھاڑ میں بیٹھے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس جمہوری تماشے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا کیونکہ ان کی بھوک پیاس مٹ رہی تھی اور پھر انہیں لیڈر بننے کا شوق بھی نہیں تھا۔ کیونکہ لیڈر بن کر وہ پہلے بھی کئی بار بدنام ہو چکے تھے اس لیے وہ ایسا کوئی شوق پالنے کے چکر میں نہیں تھے۔ لیکن گدھے کی آمد نے ان کے بھی کان کھڑے کر دیے تھے اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ادھر ہاتھی اپنی مستی میں مست ، اپنے خاندان کو یکجا کرکے یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ انتخاب جیت سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا نظم و ضبط بہترین تھا اور وہ طاقتور بھی تھے لیکن ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی اور کو اپنے ساتھ ملانے میں ابھی تک ناکام رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی ان کا ساتھ دینا چاہے وہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے لیکن بھلا ایسا کیسے ممکن تھا۔ ہر کوئی تو ہاتھی بن نہیں سکتا تھا اور وہ ہر ایک کو اپنی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔

گینڈے بھی اپنی سینگ سے آگے دیکھنے کو تیار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی کسی کے ساتھ ملنے کے لیے تیار نہیں تھے البتہ آگے آگے چلنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اکثر چلتے چلتے بہت دور نکل جاتے تھے اور پیچھے جب بھی پلٹتے تو ان کے پیچھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

زرافے اپنی گردن گھما گھما کر یہ ساری خبریں جنگل میں آگ کی طرح پھیلا رہے تھے۔ دور دور تک دیکھنے کے باوجود انہیں اکثر اپنے قریب میں ہونے والے واقعات کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ذرا ڈرپوک تھے یا پھر کسی سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لیکن گدھے کے شور نے انہیں بھی اپنی گردن اپنی طرف گھمانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی لیے اب

انہیں کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اسے گدھے میں اپنے مفادات جو دکھائی دینے لگے تھے۔ اسی لیے وہ ہر وقت گدھے ہی کی باتیں کرنے لگے تھے۔

جنگل کا انتخابی دنگل جوں جوں قریب آ رہا تھا، گیدڑ کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے گدھے کو ڈرانے کے لیے کچھ کتوں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا جو روز اس کے پیچھے بھونکتے۔ اس طرح وہ گدھے کی آواز کو دبانے میں تو کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن اکثر جانوروں کو گدھے سے دور رہنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا۔

اس سارے کھیل تماشوں سے دور بہت ہی دور جنگل کے کنارے دریا پر مگرمچھ بیٹھے آنسو بہا رہے تھے اور ان کے آنسو خشک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پتا نہیں انہیں کیا دکھ تھا جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پیٹ بھی بھرے ہوئے تھے اور دانت بھی خون آلود تھے۔ ان کے دانت صاف کرنے کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی پرندہ آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا اور ان کی مظلومیت بھری بپتا سنتا تھا۔ ان کی خاموشی سے اکثر جانور یہ سمجھتے تھے کہ یہ سوگ میں بیٹھے ہیں۔ ان کی لگائی ہوئی موم بتیاں بھی سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔ پھولوں کی پتیاں پتا نہیں کہاں سے یہ لے کر یہاں بیٹھ جاتے تھے اور پھر دن بھر مگرمچھ آنسو بہاتے رہتے تھے۔

گیدڑ کو اپنی حکومت جاتی دکھائی دینے لگی تو اسے پتا نہیں کیوں یہ لگنے لگا کہ جمہوریت خطرے میں ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پرانے حریف بن مانسوں سے بھی ہاتھ ملانے میں کچھ عار محسوس نہ ہوئی۔ بن مانس تھے تو بڑے ہی بھلے مانس لیکن وہ صرف اپنوں کے لیے تھے۔ سارے جانور انہیں بہت شریف سمجھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ لیکن ان کے کالے کرتوتوں سے صرف وہی جانور آگاہ تھے جو اس کا شکار رہ چکے تھے۔ ان کی شرافت کا لبادہ اکثر جانوروں کو دھوکہ میں ڈال دیتا تھا۔ بندر سب سے زیادہ ان کے فین دکھائی دیتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کی نسل سے ہی ہیں۔

گیدڑ اور بن مانس بظاہر تو دونوں ایک دوسرے کے سخت حریف اور دشمن سمجھے جاتے تھے لیکن یہ بات بہت کم جانور جانتے تھے کہ یہ گہرے دوست ہیں۔ انتخابی دنگل سے قبل دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ کس طرح انتخاب جیتنا ہے۔ دونوں نے مل کر ایک تحریری معاہدہ بھی طے کرلیا جو ابھی تک تحریری شکل میں نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے جرائم پر پردہ رکھنے کا وعدہ کیا اور باری باری حکومت کرنے کا عہد کیا۔ پھر باہمی رضامندی سے انتخابی دنگل کو کروانے کے لیے لومڑیوں کو یہ کام سونپ دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ اس جنگل میں اب بن مانس حکومت کر رہے ہیں۔ گدھے آج بھی جنگل میں شور مچا رہے ہیں لیکن کوئی ان کی ایک سننے کو تیار دکھائی نہیں دیتا۔ شیر اپنی کچھاڑ میں بیٹھے ہیں اور جنگل کو محفوظ قرار دے رہے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کبھی کبھی وہ کوئی بڑی کاروائی کرتے ہیں۔ جنگل میں آج بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون ہے۔ اس جنگل پر ہر وقت گدھ منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں لیکن سب خوش ہیں .....کہ وہ تو ابھی محفوظ اور زندہ ہیں۔ کیا آپ نے ایسا جنگل دیکھا ہے؟

# غیر سیاسی سیاست

"آج میں سیاست پر بالکل بات نہیں کروں گا۔"

"تو پھر کس پر بات کروگے؟"

"کسی پر بھی لیکن سیاست پر نہیں، آپ کھیل کی بات کرو۔ "

"کھیل میں تو سیاست ہے۔ "

"اچھا تو آپ فلموں پر بات کر لو۔ "

"وہاں پر بھی سیاست ہے۔"

"تو پھر آج ہم کاروبار پر بات کرتے ہیں۔ "

"آپ کا کیا خیال ہے کاروبار بغیر سیاست کے چل سکتا ہے؟ "

"نہیں .....ایک قدم بھی نہیں۔"

" کھیل، فلم اور کاروبار غرض کوئی شعبہ زندگی ایسا نہیں جس کی خبریں اخبارات کی زینت نہ بنتی ہوں اور جن کی خبر بنتی ہوں اس میں سیاست خود بخود آ جاتی ہے!"

"تو پھر آپ ہی بتاؤ وہ کون سا موضوع ہے جو سیاست سے پاک ہے؟"

"سیاست!!"

"ہیں.....!! سیاست ، سیاست سے پاک ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ "

"آپ غیر سیاسی سیاست پر بات کرو یہ سیاست سے پاک ہے۔ "

"مطلب؟ "

آپ نے اکثر سیاستدانوں کے منھ سے یہ جملہ سنا ہوگا کہ میں اس پر سیاست کرنے "
"نہیں آیا...... یا سیاست بعد میں کریں گے ابھی کام کرلیں۔

"یعنی سیاست کو سیاست سے پاک سیاستدان ہی بنا رہے ہیں۔ "

سیاست تو گویا ہمارے ہر شعبہ زندگی میں خون کی طرح رچی بسی ہوئی ہے۔چاہے وہ"
ہمارے سیکورٹی ادارے ہوں، عدلیہ ہو، بیوروکریٹس ہوں یا ٹیکنوکریٹس یہ سب آپ کو
"وافر مقدار میں سیاست میں نظر آئیں گے۔

"لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ سیاست میں غیر سیاسی لوگ موجود ہیں۔ "

جی ہاں غیر سیاسی سیاست کی بے حد کامیابی کے بعد اسے سیاستدانوں نے بھی اپنا لیا ہے "
"۔

"لیکن اس طرح وہ سیاست کیسے کر سکتے ہیں؟"

غیر سیاسی سیاست ہمارے ملک میں مقبول ہو رہی ہے۔اس لیے سیاست کو برا کہہ کر "
"غیر سیاسی سیاست کی جاتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ میں سیاست پر آج بات نہیں کروں گا اور آپ مستقل مجھ سے "
"سیاست پر ہی بات کیے جا رہے ہیں۔

"اسی کو تو کہتے ہیں غیر سیاسی سیاست۔"

"یہ تو کھلی منافقت ہے۔"

ہم اور ہماری قوم پچھلی کئی دہائیوں سے یہی تو کرتی چلی آ رہی ہے۔پاکستان "

اسلام کے نام پر بنایا اور نظام انگریزوں کا چلا رہی ہے۔ جرنیل حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لیں گے لیکن ہمارے ملک پر پچھلی کئی دہائیوں سے جرنیل حکومت کر چکے ہیں۔"

گویا منافقت کو ہم نے سیاست کا نام دے دیا ہے۔ لیکن سیاست تو عبادت ہے۔ خلق" خدا کی خدمت کا نام ہے۔"

"یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب سیاست سے منافقت کو نکالا جائے۔"

"!! اور اس کے لیے ہمیں غیر سیاسی سیاست کی ضرورت پڑے گی"

تو چلو آج سے ہم غیر سیاسی پارٹی بناتے ہیں جس کا منشور ہوگا منافقت سے پاک" سیاست۔"

"تو پھر میں چلتا ہوں۔"

"کہاں ؟"

"ایسے شخص کو ڈھونڈنے جو غیر سیاسی بھی ہو اور منافقت سے بھی پاک ہو۔"

☆.....☆

# سب بیچ دے! نیا پاکستان نہیں چاہیے

نواز شریف صاحب نے پی آئی اے کے دو ملازمین کی شہادت کی ذمہ داری قبول"
"کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔
"!! یہ آپ کی خواہش ہے یا خبر"
"خبر تو ہو نہیں سکتی اسی لیے خواہش کو ہی خبر بنایا ہے۔"
"بھلا وہ کیوں استعفیٰ دیں وہ 'ذمہ دار' نہیں۔"
وہ غیر ذمہ دار ہیں تو پھر ذمہ دار کون ہے؟ کیونکہ قانون نافذ کرنے والے اداروں"
"نے بھی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔
ان کی ذمہ داری ہے جو گولیوں کا نشانہ بنے۔ یہ گولیوں کے سامنے نہ آتے اور نہ یہ"
"واقعہ پیش آتا۔
"تمہارا مطلب ہے گھر بیٹھ کر احتجاج کرتے۔"
جی ہاں! احتجاج کرنے کا حق صرف سیاستدانوں کے پاس ہے۔ عوام یہ کام کرے گی تو"
"اسے گولیاں اور لاٹھیاں کھانی ہوں گی۔
ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ بڑے بڑے واقعات اور سانحات پیش آتے ہیں لیکن کوئی"
"ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔
ایسی بھی کوئی بات نہیں ایک جماعت ہے جو ہر واقعہ کی ذمہ داری بلا جھجھک قبول"
"کرتی ہے۔

''وہ کون سی جماعت ہے؟''

طالبان اور القاعدہ..... کم از کم ہر واقعہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں چاہے کسی نے''
''بھی کیا ہو۔

''لیکن اس بار تو انھوں نے بھی ذمہ داری قبول نہیں کی۔''

''اسی لیے تو چیئرمین پی آئی اے نے استعفیٰ دے دیا ہے۔''

''کیا وہ ذمہ دار ہیں؟''

جب ذمہ دار لوگ اپنی ذمہ داری قبول نہ کریں تو ان کو اپنی ذمہ داری پر رہنے کا کیا''
''حق پہنچتا ہے؟

''یہ حق ان کو عوام نے دیا ہے۔''

''عوام نے ملک کو چلانے کا حق دیا تھا نہ کہ ملک کے اثاثوں کو بیچنے کا۔''

''پی آئی اے کی نجکاری کیے بغیر نہیں چلایا جاسکتا۔''

اب ایسی بات بھی نہیں، میاں صاحب ملک چلا سکتے ہیں تو پی آئی اے کیا چیز ہے۔ ان''
کے پاس ایسا نسخہ خاص ہے جس پر عمل کرکے پی آئی اے کو نہ صرف بچایا جاسکتا ہے بلکہ
''اڑایا بھی جاسکتا ہے۔

انہوں نے وہ نسخہ خاص زرداری صاحب کو دیا تھا کہ وہ نیویارک کا ہوٹل بیچ کر پی ''
'' آئی اے کو کھڑا کریں۔

'' ! میاں صاحب کے پاس تو کچھ بھی نہیں''

''اگر کچھ ہوتا تو وہ پی آئی اے کبھی نہ بیچتے۔ خسارہ بہت بڑھ چکا ہے۔''

”خسارہ تو ملک کا بھی بہت بڑھ چکا ہے، کہیں ملک کی بھی نجکاری تو نہیں ہو جائے گی۔“
”اگر اسی طرح نجکاری کا عمل جاری رہا تو وہ دن بھی دور نہیں جب ملک بھی بک جائے گا۔“
”پہلے جنگیں لڑ کر ملک پر قبضہ کیا جاتا تھا لیکن اب ملک کے اثاثہ جات پر قبضہ کیا جاتا ہے۔“
”!! سب بیچ دے ..... نیا پاکستان نہیں چاہیے“
”سب بیچنے کے بعد سیاستدان تو ملک سے باہر چلے جائیں گے لیکن عوام ان کے قرضے نسل در نسل غلامی کی صورت اتارے گی۔“
”اگر یہ بات ہے تو ہم اگلے الیکشن میں انہیں ووٹ نہیں دیں گے۔“
”آپ اپنا ووٹ اپنے پاس رکھیں، اگلے الیکشن تک تو یہ سب بیچ چکے ہوں گے۔“
”اچھا اسی لیے زرداری صاحب پہلے ہی ملک سے باہر جا چکے ہیں۔“
”!! ..... اور اب میاں صاحب“

☆.....☆

# جواب کون دے گا؟

ذہن میں اٹھنے والے سوالات اور شبہات پہلے کیا کم تھے جو میڈیا ٹاک شوز کے بعد اُن میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ ہر شخص کے پاس ایک سوال ہے اور جواب میں ایک اور سوال ہے۔ یہ سوالات کا سلسلہ کچھ ایسا چل نکلا ہے کہ عام انسان کا ذہن انتشار کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے میں بے شمار سوالات کے درمیان ایک اہم سوال یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جواب کون دے گا؟ میرے خیال میں ایسا صرف اسی معاشرہ میں ہوتا ہے جہاں کوئی بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہ کرے اور اپنی ذمہ داری اور غلطی کو دوسروں پر ڈال کر خود کو بری سمجھنے کا رجحان ہو۔

میڈیا پر کسی حکومتی نمائندے سے سوال کیا جائے کہ حالات کیوں قابو نہیں ہو رہے تو اس کا پہلا جواب تو یہی ہوگا کہ ایسا ہے ہی نہیں اور اگر مان بھی لیا جائے تو اس میں اپوزیشن کا قصور ہے۔ اپوزیشن تو پہلے ہی سوال لے کر بیٹھے ہیں اور پھر ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے کھینچتے وقت پورا ہوگیا اور سوال وہیں کا وہیں موجود ہے۔ جواز بدتر از گناہ کے مصداق جواب ملتا ہے۔ جیسے انہوں نے استعفیٰ نہیں دیا تو ہم کیوں دیں؟ ہم نے کرپشن کی ہے تو کیا ہوا؟ انہوں نے بھی تو کی ہے۔ پہلے اسے گرفتار کریں۔

میں نے اپنے بچے کو آواز دی کہ بیٹا ادھر آؤ۔ اس نے وہیں سے جواب دیا جی آیا۔ لیکن آیا پھر بھی نہیں۔ پھر میرے غصہ کو دیکھ کر جب بادل نخواستہ آیا بھی تو میں نے اسے کوئی کام کرنے کو کہا۔ وہ جی کہہ کر چلا گیا۔ لیکن پھر کافی دیر تک وہ نہیں آیا تو میں نے پھر بلایا۔ وہ پھر بادل نخواستہ آیا۔ میرے غصہ پر کہنے لگا کہ میں آپ کے حکم کا احترام کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کیسا احترام ہے کہ بات تو مانی ہی نہیں اور احترام اپنی جگہ قائم ہے۔ ہماری حکومتیں بھی کچھ ایسے ہی احترام پر یقین رکھتی ہیں اور بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ ہم نے عدالتوں پر حملہ نہیں کیا لیکن کیا یہ کم ہے کہ عدالتوں کے احکامات کو صرف نظر کرکے خود جج بن کر بیٹھ جایا جائے۔ میرے نزدیک یہ رویہ کسی حملہ سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ حملہ صرف ایک بار کیا جاتا ہے اور کسی کی اہمیت کو ہی ختم کرکے رکھ دینا حملہ کرکے قتل کردینے کے مترادف ہے۔

ماضی سے لے کر آج تک بے شمار سانحات اور حادثات رونما ہوئے لیکن ہم نے کسی ایک کا بھی جواز تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی بدقسمتی سے کسی کو کسی واقعہ کا قصور وار ٹھہرایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حادثات تھمنے کے بجائے بڑھتے ہی چلے جارہے ہیں۔ غلطی انسانی کمزوری ہے اور یہ زندگی کا حصہ ہے لیکن اس کا اعتراف نہ کرنے کی بڑی وجہ سزا کا خوف اور پشیمانی ہے۔ ہم ایسے

لوگوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ قائد اعظم جیسے عظیم رہنما پہلے کانگریس میں تھے لیکن جب انہیں حقیقت کا ادراک ہو گیا تو انہوں نے کانگریس چھوڑنے میں بالکل تاخیر نہ کی۔

ہم اپنی منزل کا تعین کرتے ہیں اور اس کے لیے کسی بھی ایسی پارٹی کا انتخاب کرتے ہیں جو آپ کے خیال میں اس کے حصول میں معاون ہوسکے۔ لیکن اگر آپ محسوس کریں کہ پارٹی کسی اور سمت میں سفر کر رہی ہے اور آپ جانتے بوجھتے اسی میں سفر کرتے رہیں تو یہ کدھر کی دانشمندی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم پارٹی کو ہی اپنی منزل بنالیں۔ زندگی کسی ایک مقصد کے گرد گھومتی ہے۔ اب یہ مقصد ذاتی مفاد بھی ہو سکتا ہے، پیسے کا حصول بھی ہوسکتا ہے، طاقت کا حصول بھی ہوسکتا ہے، خود نمائی کا شوق بھی۔

ہماری حالت ایسی شاہراہ کی سی ہے جس پر ٹریفک جام ہے اور ہر کوئی اپنا ہارن بجا کر راستہ لینا چاہتا ہے۔ جس کا دل جدھر چاہتا ہے اپنی گاڑی نکالنے کی فکر کرتا ہے بلا سوچے سمجھے کہ جب تک آپ راستہ نہیں دیں گے، آپ کو بھی راستہ نہیں ملے گا۔ اسی کشمکش میں وقت کا ضیاع بھی ہو رہا ہے اور منزل کی طرف سفر بھی رک کر ذاتی مفاد میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ کوئی لیڈر نہیں جو ہمیں منظم کرکے ہمیں اس الجھن سے نکال سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ

جو سمجھ میں آتا ہے بند راستہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن راستے ایسے نہیں کھلا کرتے۔ اس کے لیے کسی ایک ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے کہنے پر چلا جائے اور اسی کے کہنے پر رکا جائے۔ ورنہ اس طرح سو سال بھی گزر گئے تو ہم اسی بند شاہراہ پر اپنی زندگی کا ایندھن ختم کر دیں گے۔

# سوچتا ہے کیا، سوچنا ہے کیا؟

میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب زلزلے آتے ہیں تو لوگ اپنے گھروں سے باہر کیوں نکل آتے ہیں؟ کیا موت سے بھی کوئی فرار ممکن ہے؟ اور پھر ہم گھروں سے نکلنے کیلئے زلزلے آنے کا ہی انتظار کیوں کرتے ہیں؟ آفت کے آنے سے پہلے اس کا سدباب کیوں نہیں کرتے؟ اللہ نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے لیکن جانور ہم سے پہلے آنے والی آفت کا پتا دے دیتے ہیں۔ چیونٹیوں کو دیکھتا ہوں وہ ہر وقت رزق کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتی ہیں، کھانا کھا کر سو نہیں جاتیں بلکہ رزق کا ذخیرہ جمع کرتی رہتی ہیں اور پھر جب کبھی بارش ہو جائے یا کوئی برا وقت آ جائے تو ان کے ٹھکانوں میں وافر مقدار میں ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ لیکن ہمیں تو اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ صبح سویرے ہی اٹھ جائیں کجا اس کے کہ اس رب کا شکر ادا کریں کہ اس نے نیا دن دیکھنا نصیب کیا۔ پھر پرندوں کو دیکھتا ہوں وہ صبح اٹھ کر پہلے شکر ادا کرتی ہیں پھر رزق کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں اور جب شام کو واپس آتی ہیں تو کسی کا پیٹ خالی نہیں ہوتا۔ ہم گھر بیٹھ کر بس شکوہ شکایت ہی کرتے ہیں۔ اگر کام پر بھی جائیں تو دل لگا کر کام نہیں کرتے۔ بادل نخواستہ کام سرانجام دیتے ہیں اس کو اپنی ڈیوٹی اور فرض سمجھ کر انجام نہیں دیتے۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم آگے نہیں بڑھ رہے۔ ہم کیوں یہ بات

بھول جاتے ہیں کہ ہم سب اس معاشرہ کا حصہ ہیں ہمیں وہی کچھ ملے گا جو ہم اس معاشرہ کو دیں گے۔ کانٹے بو کر پھولوں کی امید رکھتے ہیں۔ دوسروں کے لیے وہی چیز پسند نہیں کرتے جو اپنے لیے کرتے ہیں پھر کوئی کیوں آپ کے لیے اچھا چاہے گا۔ ہم اچھے دوستوں کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن خود اچھا دوست نہیں بنتے۔ اپنے بچوں کو اچھا انسان دیکھنا چاہتے ہیں لیکن خود اچھا انسان بن کر نہیں دکھاتے۔

میں ہر ایک پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں لیکن مجھے خود پر تنقید پسند نہیں شاید مجھ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ میں ہر ایک کے ساتھ مذاق کرتا ہوں لیکن جب میرے ساتھ کوئی مذاق کرے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں اپنی ساری توجہ اپنے جسم اور چہرے کی خوبصورتی پر رکھتا ہوں لیکن میرے اندر چھپے داغ اور دھبے مجھ سے اوجھل رہتے ہیں۔ میں اپنے جسم کو روز کھلا پلا کر صحت مند اور توانا بناتا ہوں لیکن جسم میں چھپی روح کو بھوکا اور پیاسا رکھتا ہوں۔ اس کی ضرورتوں سے میں کلی ناواقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بے سکون رہتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں لیکن سمجھ کر بھی کچھ سمجھ نہیں پاتا۔ وقت ہے کہ گزرتا جاتا ہے اور میں اسی سوچ میں رہتا ہوں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ وقت بھی کتنا ظالم ہے گزر کر پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ برف کی مانند پگھلتا ہی چلا جاتا ہے اور میں یادوں کی صورت ماضی کا قصہ بنتا چلا

جاتا ہوں۔ میرے خیال اور میری سوچ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے دوست ، میرے عزیز، میرے ساتھی ایک ایک کرکے اس دنیا سے گزرتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ اب میرے پاس سوچنے کا بہت وقت ہے لیکن کرنے کی ہمت نہیں کیونکہ میرے جسم میں ریشہ آگیا ہے۔ میرا جسم اب میرا ساتھ نہیں دیتا۔ عمر بھر جس کا میں نے خیال رکھا تھا، جس کے لیے اپنے رب کو بھول گیا تھا وہ اب میرا ساتھ نہیں دیتا۔ ایسے میں مجھے خدا کی یاد آنے لگتی ہے اور وہ مجھے بہت قریب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن عمر بھر کے گناہوں کا بوجھ اور شرمندگی اب مجھے اس طرف مائل نہیں ہونے دیتی۔ میں سوچتا ہوں اس وقت ہمیں خدا کیوں یاد آجاتا ہے؟ اب مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی اور میں اکثر لیٹا سوچتا ہی رہتا ہوں۔ مجھے یہ دنیا اچھی نہیں لگتی جہاں میں نے اک عمر گزاری تھی۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے سوچنا کیا ہے اور میں سوچ کیا رہا ہوں؟ کیا آپ نے کبھی ایسا سوچا ہے؟

# بِین بجاؤں کہ بَین کروں

"میاں صاحب کہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"اگر میاں صاحب کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کیونکہ وہ غلط کہہ ہی نہیں سکتے۔"

"اگر وہ غلط نہیں کہتے تو پھر غلط کو وہ کیا کہتے ہیں؟"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ تو غلط کو غلط بھی نہیں کہتے۔ جھوٹ تو گویا ان کی ڈکشنری میں ہی نہیں ہے۔"

"تبھی تو..... جھوٹ ڈکشنری میں نہیں ہے اسی لیے جھوٹ کو وہ سچ کہتے ہیں۔"

"اور سچ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ڈکشنری میں ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر یہ جو اتنے سارے جھوٹ ہیں یہ کون کہتا ہے عوام سے؟"

"یہ جھوٹ نہیں وعدے ہیں، وعدہ خلافی ہو سکتی ہے لیکن جھوٹ ..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"!! اچھا جی ..... یہ بات ہے"

"اور ہاں آپ نے سنا نہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں خدمت عبادت سمجھ کر کرتا ہوں۔"

"ہماری عبادات کا جو حال ہے آپ کو معلوم ہے، ہم ہفتہ میں ایک بار نماز"

جمعہ کے لیے تشریف لے جاتے ہیں یا پھر عید کے عید اپنا چہرہ مسجد کو دکھاتے ہیں۔ اس
"سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو حال عبادت کا ہے وہی خدمت کا ہوگا۔
یہ خدمت اور سچائی کی ہی اعلیٰ مثال ہے کہ عوام دنیا کا سستا ترین پیٹرول استعمال"
"کر رہے ہیں۔
"اگر آپ ہمیں یہ بات نہ بتاتے تو شاید ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔ "
عوام کا پیٹرول نکالنے والے وزیر کہتے ہیں کہ عوام کو پیٹرول مفت پڑتا ہے بس"
"تھوڑا' سا ٹیکس ہے جو انھیں ادا کرنا پڑتا ہے۔'
میں نے تو خزانہ بانٹنے والے وزیر سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے ہمارے آنے"
"والے دن بہتر ہوں گے۔
آپ نے ٹھیک سنا ہے، صحافیوں نے بھی جب یہ کہتے سنا تھا تو ان کی خوشی کا بھی ٹھکانہ "
نہیں رہا تھا لیکن جب سوال کرنے کے لیے قریب پہنچے تو پتہ چلا موصوف اپنے بیٹے سے
"موبائل فون پر گفتگو فرما رہے تھے۔
فون سے یاد آیا دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے نیکٹا کی ہیلپ لائن پر رواں سال"
"کالز موصول ہوئیں جن میں سے 8020 نے گانا سننے کی فرمائش کی۔8160
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی کا کس طرح جڑ سے خاتمہ ہوگیا ہے کہ اب"
"عوام امن کی بانسری سننا چاہتی ہے۔
"امن کی بانسری سننی ہو تو آپ سائیں سرکار سے سن سکتے ہیں۔"
لیکن سائیں سرکار کو تو بین پسند ہے کیونکہ اس سے نیند میں خلل نہیں"

''پڑتا۔ ورنہ پورا دن عوام کے بَین سن سن کر تنگ آ جاتے ہیں۔
بِین بھینس کے آگے بجائیں یا پیچھے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ''
ہماری سائیں سرکار پیچھے پیچھے سب سنتے ہیں لیکن جیسے ہی کوئی آگے آ کر بجائے تو اسے
''گرفتار کر لیا جاتا ہے۔
'' ایسا کیا ہو گیا ؟ ''
آپ پورے شہر میں جہاں چاہیں کچرا پھینکیں لیکن اگر سائیں سرکار کے گھر کی سامنے ''
''پھینکیں گے تو آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔
وہ بھلے مانس انسان ہیں کبھی کسی بھی بات کا نوٹس نہیں لیتے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے ''
تو لوگ کہتے کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ اقدام مجبوری میں اٹھایا ورنہ وہ تو
'' کسی کو بھی گرفتار ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے۔
''گرفتار نہیں کریں گے تو کرپشن کا گند پورے ملک کو کھا جائے گا۔''
'' میں تو کہتا ہوں کرپشن کا خاتمہ نہیں کرنا ہے تو اس کی بھی نجکاری کر دی جائے۔''
شریف لوگ کبھی بھی اس کی نجکاری نہیں ہونے دیں گے۔ آپ خواہ مخواہ شریف ''
''لوگوں کو تنگ کرتے ہیں۔
''اگر آپ شریف ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہمیں بھی تنگ کرنا چھوڑ دیں۔''
'' اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر دونوں مل کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔''

”اب تمہیں کچھ نظر آ رہا ہے؟“

” ..... نہیں “

”!!..... اور مجھے بھی“

☆.....☆

# خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے

ویسے تو میں کرکٹ میچ اب نہیں دیکھتا لیکن کسی زمانہ میں میچ دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اس شوق اور جنون میں اس وقت کمی آنا شروع ہوئی جب کچھ شعور بیدار ہوا اور میچ فکسنگ کے اسکینڈل نے سر اٹھانا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح جس میچ کو دیکھ رہے ہیں وہ تو ایک ڈرامہ ہے جو پہلے سے لکھا جا چکا ہے کہ کیا کیا ہونا ہے؟ جس طرح نورا کشتی کی ریسلنگ کو امریکہ میں بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی جانتے بوجھتے ایسے میچ دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

خیر ذکر ہو رہا تھا کرکٹ میچ کا اور حال ہی میں ایشیا کپ میں جب بھارت اور پاکستان مدمقابل تھے تو میں اس میچ کو وقت گزاری کیلئے دیکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن دلچسپ بات اس وقت سامنے آئی جب میری بیگم نے مجھے اس وقت ٹی وی بند کرنے کو کہا جب پاکستان کی وکٹیں یکے بعد دیگرے گرتی چلی گئیں۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ یہ تو میچ کا حصہ ہے، جب پاکستان جیت رہا تھا تو آپ خوشی سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور جب ان کی باری آئی تو آپ ٹی وی بند کر رہے ہیں۔ اب میری اس میچ میں دلچسپی اور بڑھ گئی کیونکہ اب میں اپنے عدم برداشت کے رویے کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ اگر آپ بھی عدم برداشت کا شکار ہیں تو میں آپ سے

بھی یہی کہوں گا کہ ایسے میچز کو دیکھیں اور اپنے اندر برداشت پیدا کریں۔ یہ کہنا بہت آسان لیکن کرنا بہت مشکل ہے لیکن منزل مشکلات سے گزر کر ہی ملا کرتی ہے اور ہم آسانی کے قائل ہیں۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ کچھ دن پہلے میرے ساتھ رونما ہوا جب میں ایک سیاستدان کو ٹی وی پر سن رہا تھا تو میرے پیچھے سے میرے دوست نے مجھے یہ کہہ کر ٹوکا کہ اسے مت سنو دماغ خراب ہوگا۔ میں نے مسکرا کر اس کی بات سنی ان سنی کردی کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی عدم برداشت کا شکار ہے اور اپنے مخالف کو سننا پسند نہیں کرتا۔

میرے ایک دوست فیس بک بہت استعمال کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ اس سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ تو کہنے لگے ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ تو میں نے اگلا سوال یہ پوچھا کہ بتاؤ تمہارے دوستوں کی فہرست میں کون کون لوگ شامل ہیں۔ بڑے فخر سے بتانے لگے کہ سب میرے ہم خیال دوست ہیں۔ میں نے ہر نئے شخص کو بلاک کر رکھا ہے۔ تو میں نے مسکرا کر کہا تو اس طرح تم اپنے دوستوں اور ہم خیال لوگوں میں اپنی باتیں گوش گزار کر رہے ہو جو پہلے ہی تمہارے ہم خیال ہیں۔ اپنے کنویں میں ٹرٹر کرکے اور خود کو عدم برداشت کے خول میں بند کرکے ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم دنیا کے خیالات کو بدل رہے ہیں

تو شاید ہم کسی کو نہیں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہماری بات سنیں لیکن ہم خود کچھ سننے کیلئے تیار نہیں۔ جہاں کوئی آپ کی بات میں ہاں میں ہاں ملائے گا آپ اسے اپنا دوست سمجھیں گے اور جہاں اس نے نفی کی آپ نے اس کو اپنا دشمن گردانا شروع کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عدم برداشت ہم میں کیسے پیدا ہوتا ہے؟اور کیا اس سے چھٹکارا بھی ممکن ہے کہ نہیں؟

اسلام نے برداشت کا سبق آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں دیا تھا اور صرف سبق ہی نہیں دیا بلکہ ثابت بھی کرکے دکھایا تھا۔ وہی عرب جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے آپس میں انصار اور مہاجر اس طرح اخوت کی لڑی میں پرو گئے کہ جو رہتی دنیا کیلئے مثال ہیں۔ پھر فتح مکہ کے انقلاب کی مثال ہمارے لیے برداشت کا وہ بہترین نمونہ ہے جو دنیا نے آج تک نہیں دیکھا۔ فتح مکہ کے بعد ہر ایک کو عام معافی مل گئی۔

حضرت علیؓ کا ایک دشمن سے مقابلہ ہوا اور آپ اس پر حاوی ہوگئے اور پھر جیسے ہی اس پر تلوار چلانے لگے دشمن نے اُن پر تھوک دیا۔ اسی وقت آپؓ اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دشمن حیران رہ گیا اور اس عمل کی وجہ دریافت کی۔

آپؐ نے فرمایا کہ ہم اللہ کیلئے لڑتے ہیں۔ لیکن جب تم نے مجھ پر تھوکا تو مجھ میں تمہاری ذات کیلئے غصہ پیدا ہوا اور اگر اب میں تم پر تلوار چلاؤ تو میں اللہ کیلئے نہیں اپنی انا کی تسکین کیلئے چلاتا۔ یہ ہے عدم برداشت کی طاقت جسے ہم کمزوری خیال کرتے ہیں۔

نیلسن منڈیلا 27 سال انگریزوں کی قید میں رہے۔ ان 27 برسوں میں 6 سال وہ قید تنہائی بھی شامل تھی جس میں انہوں نے باہر کی کوئی آواز نہ سنی اور نہ ہی انہوں نے باہر کا آسمان دیکھا۔ یہ ایک ایسی اذیت ناک قید تھی کہ جس کا تصور بھی محال ہے کجا یہ کہ معافی کا سوچا جائے لیکن نیلسن منڈیلا نے اس قید سے باہر آتے ہی ان سب لوگوں کو معاف کر دیا کہ جنہوں نے اس پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے۔اس نے اقدار میں آتے ہی نہ صرف انگریز عملہ کو اپنی جگہ پر بحال رکھا بلکہ اپنی سیکوریٹی تک کیلئے انہیں اپنی جگہ پر تعینات رکھا اور اس طرح ان کی سیکورٹی انگریز عملہ ہی سرانجام دیتا رہا جو ایک انتہائی مشکل فیصلہ تھا لیکن انہوں نے اپنے عدم برداشت سے یہ سب کر دکھایا۔

عدم برداشت وہ بیماری ہے کہ جس کا تریاق اس کے اپنے زہر کے اندر ہے۔ اگر آپ میں عدم برداشت ہے تو آپ اپنے مخالفین کو سننا شروع کر دیں جس حد تک سن سکتے ہیں، اپنی باری کا حق چھوڑ کر دوسرے کو اپنی باری دینا شروع کر دیں۔ جس نے

آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے کم از کم آپ دل میں اسے خیال کرکے معاف کریں۔ پھر دیکھئے آپ میں برداشت کی قوت میں اضافہ ہونا شروع ہوجائے گا۔ آغاز میں یہ تھوڑا مشکل ضرور ہوگا لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جیسے جیسے آپ آگے بڑھتے جائیں گے آپ کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔ یاد رکھئے عدم برداشت کی بیماری دوسروں کو کم آپ کو زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔

اگر میں آخر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ مذہب سے دوری بھی عدم برداشت کو جنم دیتی ہے۔ مذہب ہمیں حق چھیننا نہیں بلکہ حق دینا سکھاتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اگر تم جانتے بوجھتے اپنے حق کو چھوڑ دو کہ ( فساد پیدا نہ ہو) تو اللہ کے ہاں تم اس کا بہترین اجر پاؤگے۔ جس زندگی میں خدا کی خدائی کا کوئی وجود نہ ہو تو اس زندگی کے متعلق تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

# کراچی کا کچرا

''کچھ سنا آپ نے ضمیر جاگ گیا ہے؟''

''مبارک ہو لیکن اس کو جگایا کس نے ہے۔ ضمیر تو گہری نیند سو رہا تھا۔''

جگانے والے نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی شرط پر بتایا ہے کہ ضمیر کو بتایا گیا تھا''

''کہ اگر وہ نہیں جاگے گا تو اسے گہری نیند سلا دیا جائے گا۔

''ضمیر نے جاگنے کے بعد کیا 'کمال' کیا ہے؟''

بھائی کی شان بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ہر خاص و عام پہلے ہی واقف''

''ہے۔

''پھر نئی بات کیا ہے؟''

نئی بات یہ ہے کہ برسوں سے 'قائم' افراداور 'ڈاکٹر' بھی اس 'کمال' کا شکار ہو رہے''

ہیں۔بہت جلد محکمہ سیاسی موسمیات نے مزید بارش کی پیش گوئی کی ہے اور وہ بھی گرج

''چمک کے ساتھ۔

اسی لیے کراچی والوں نے شہر کی صفائی کا اعلان کر دیا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ بارش کا''

پانی کہیں شہر میں جمع نہ ہو جائے۔ اس لیے جتنی جلد ممکن ہوسکے اس پانی کو جمع نہ

''ہونے دیا جائے اور گٹروں کی صفائی شروع کر دی گئی ہے۔

ابھی تو کراچی میں گٹروں کی غلاظت جمع ہے یہ نکلے گی تو بارش کے صاف پانی کو نکلنے''

''کا راستہ ملے گا۔

کراچی والے بھائی نے عہد کیا ہے کہ وہ اس غلاظت کو شہر سے نکال کر ہی دم لیں گے ''
''اور اسے انجام تک پہنچائیں گے۔
کراچی میں گٹر کا پانی کیا کم تھا جو یہ بارش کا پانی بھی جمع ہونے کے لیے جگہ تلاش ''
''کر رہا ہے۔
لیکن یہ بات تو طے ہے کہ شہر میں صفائی کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی ''
''جارہی تھی اور کراچی والے کسی رحمت کی بارش کے منتظر تھے۔
لیکن میرے بھائی بارش تو آپ کے لیے وبال جان بن جائے گی۔آپ کے پاس نکاسی ''
''کا نظام جو نہیں ہے۔
''نظام تو ہے لیکن وہ اکثر سویا رہتا ہے۔جب بارش ہوتی ہے تو وہ گھر سے نکلتا ہے۔ ''
یہ تم اسی نظام کی بات کر رہے ہو ناں جس کے گھر کے باہر کسی نے کچرا ڈالا تو وہ''
''جاگ گیا تھا۔
نظام کو چھوڑو اب شہر میں جھاڑو پھرنا شروع ہو گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کچرے کو ''
'' اصل مقام پر ٹھکانے لگایا جاتا ہے یا خود کچرا پھینکنے والوں کو اصل مقام پتا چلتا ہے۔
کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو کراچی سے کئی بار کچرے کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی ''
''ہے لیکن یہ کچرا شہر سے نکلتا ہی نہیں ہے۔
اسی لیے اس کچرے کی وجہ سے شہر میں مچھروں کا راج ہے۔مجھے ڈر ہے کہ بارش ''

”کے بعد ان مچھروں کی مزید افزائش ہو گی۔

”!!.....دیکھتے ہیں اس بار بارش رحمت بنتی ہے کہ زحمت “

☆.....☆

# جذبہ ہار گیا

بات تو معمولی سی ہے اور انہوں نے کرلی معذرت بھی ہے۔ایک طویل عرصہ کے بعد بھارت اور پاکستان کی کرکٹ ٹیمیں اس دوسرے کے مقابل تھیں۔ بظاہر تو یہ ایک میچ تھا لیکن پاکستان کی ٹیم کے لیے یہ ایک 'موقع' تھا اپنی پے در پے شکست کا بدلہ لینے کا لیکن کیا کریں کہ جب جذبہ ہی ہار جائے تو میچ کیا، کچھ بھی نہیں جیتا جاسکتا۔

20 کرکٹ ورلڈ کپ کا میچ پاکستان اور بھارت کے درمیان Tایک طویل عرصہ کے بعد کھیلا جانا تھا۔ جس کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ یہ ایک میچ ہی نہیں بلکہ ایک جنگ تھی جسے کرکٹ کے میچ میں کھیلا جانا تھا۔ دونوں ہی طرف عوام کے جذبات عروج پر تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کھیل جذبات سے نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں سے جیتے جاتے ہیں لیکن جذبات کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیاجاسکتا۔ 1965ء کی جنگ ہم نے اسی جذبہ کے تحت جیتی جب ہمارے پاس جنگ کے لیے سامان بھی ناکافی تھا۔پی ٹی وی پر جس طرح عین موقع پر ملی نغمے لکھے ،پڑھے اور گائے گئے وہ آج بھی عوام کے جذبات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف 1971ء کی جنگ

ہے جس میں ہم باوجود تعداد میں اکثریت کے میدان جنگ میں ہار گئے۔
کھیل کے میدان میں اسی جذبہ کو مہمیز دینے کے لیے قومی ترانہ پڑھا جاتا ہے۔اس ورلڈکپ کے لیے پاکستان کی طرف سے شفقت امانت علی کو یہ اعزاز سونپا گیا اور دوسری طرف بھارت نے امیتھابھ بچن کو یہ اعزاز دیا کہ وہ میدان میں آئیں اور قومی ترانہ پڑھیں۔
اگر آپ نے یہ تقریب دیکھی اور سنی ہو تو یقینا آپ نے بھی یہ بات محسوس کی ہوگی کہ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔ جس جذبہ اور انداز میں پاکستان کا قومی ترانہ شفقت امانت علی نے پیش کیا شاید اس سے کئی گنا بہتر ہمارے وطن کا کوئی بھی بچہ اسے جذبہ کے پڑھ سکتا تھا۔جذبہ اگر دل میں ہو تو چہرے پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے لیکن بد قسمتی سے ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ آپ نے جس بھونڈے انداز میں قومی ترانہ پڑھا، پھر اس میں بھی الفاظ کی ادائیگی اس طرح سے کی جیسے کسی اور زبان کا قومی ترانہ پڑھنے کے لیے بلا لیا گیا ہو۔
دوسری طرف امیتابھ بچن کا جذبہ دیکھیں جنہوں نے قومی ترانہ پڑھنے کے لیے کلکتہ سے یہاں آنے تک کا سفری خرچ و رہائش 30 لاکھ روپیہ نہ صرف خود برداشت

کیا بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ انہوں نے 4 کروڑ روپیہ بھی قومی ترانہ پڑھنے کے اعزاز کے طور پر ادا کیا۔ پھر ان کے پڑھنے کا انداز دیکھیں کہ الفاظ زبان سے نہیں بلکہ دل سے ادا ہو رہے تھے۔

اس تقریب کے بعد جذبہ تو ہار چکا تھا پھر میچ ہارنے کا کیا غم کریں۔ شفقت امانت علی نے سوشل میڈیا پر اس بات پر معذرت بھی کر لی لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ معذرت کس کس بات پر قبول کی جائے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے کوئی اپنی ماں کا نام بھی بھول جائے۔ جس قومی ترانہ کو پڑھتے اور سنتے ہوئے ہم جوان ہوئے، جو اسکول کی اسمبلیوں میں روز پڑھا جاتا رہا، اسے ہی ہم بھول گئے۔

لیکن کیا کریں جب وطن کی عزت پر پیسہ حاوی آ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کتنے بے ضمیر پاکستانی ہیں جنہوں نے ملک کی شہریت پر دوسرے ملکوں کی شہریت کو ترجیح دے رکھی ہے۔ کتنے بے ضمیر ایسے ہیں جو بھارت جا کر اپنی ماں کی محبت اور پیار کو بھول جاتے ہیں اور انہیں وہاں کی محبت اپنی ماں سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ کتنے بے ضمیر ہیں جنہوں نے بھارت سے مدد کے لیے پکار کر اپنی ماں کی عزت بیچی ہے۔ ہمارے فنکار روز بھارت یاترا کے لیے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کل وہ ہمارا ٹی وی دیکھتے تھے اور آج ہم ان

کا دیکھ رہے ہیں۔

بھارت کی ثقافت اور کلچر ہمارے قوم کے جذبہ کو سرد کرچکا ہے لیکن میں ابھی بھی اپنی قوم سے مایوس نہیں کہ یہاں آج بھی جنید جمشید جیسے لوگ موجود ہیں کہ جن کے دل سے 'دل دل پاکستان' نکلتا ہے۔ کیا ہوا جو ایم ایم عالم جیسے لوگ اس دنیا سے رخصت ہوگئے جنہوں نے بنگالی ہونے کے باوجود زبان پر نظریہ کو ترجیح دی اور پاکستان میں رہنا پسند کیا۔ کیا ہوا جو مہندی حسن جیسے 'شہنشاہ جذبات' اس دنیا سے رخصت ہوگئے جنہوں نے باوجود بھارت کی مالی پیشکش کے اپنی ماں 'پاکستان' کی گود میں مرنا پسند کیا لیکن علاج کے لیے بھارت نہیں گئے۔

یہ شاید آپ کے لیے معمولی بات ہوگی لیکن یاد رکھیں جو قومیں اپنا قومی ترانہ بھول جائیں انہیں عوام تو شاید معاف بھی کردے اور بھول جائے لیکن تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی اور اگر ہم نے جذبہ کو بیدار نہیں کیا تو ہم دشمن سے اسی طرح ہر میدان میں ہارتے رہیں گے۔

# آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسانوں کی طرح رہے لیکن دنیا کی اتنی بڑی آبادی میں انسان ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ اکثر اخبارات میں انسانوں کی تلاش کے لیے اشتہارات دیے جاتے ہیں۔ لیکن مسجدوں سے جب اعلان کرایا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ جن کا بچہ ہے وہ آ کر لے جائے۔ جس طرح جگہ جگہ جنات نکالے جارہے ہیں اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ یہاں انسان نہیں بلکہ جنات بستے ہیں۔ ایک جن والے انسان سے پوچھا کہ کوہ قاف میں جگہ کم پڑ گئی ہے جو تم نے ہمارے علاقوں کا رخ کیا ہے۔ تو کہنے لگا ہمارے چاہنے والے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں بھلا ہم انہیں کیسے مایوس کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہی دم سے کچھ لوگوں کی دال روٹی چل رہی ہے۔

انسانوں میں کچھ 'زیادہ' انسان ہوتے ہیں اور کچھ 'تھوڑے' اور کچھ تو سرے سے انسان ہی نہیں ہوتے بس 'انسان نما' ہوتے ہیں۔ دو ہاتھ پاؤں ہونے کا یہ مطلب تو ہر گز نہیں کہ وہ انسان ہی ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو سب انسان برابر ہوتے لیکن کچھ انسانوں کے رہنے کے لیے ہزاروں ایکٹر زمین ہوتی ہے اور کچھ کے لیے دو گز زمین بھی میسر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا انسان کے رہنے کے لیے بنائی تھی لیکن وہ بھی تھوڑی پڑ گئی ہے۔ اس کی وجہ انسانوں کی بڑھتی ہوئی

آبادی کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن میری ناقص عقل میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ دنیا کی ہزاروں ایکڑ زمین پھر بھی خالی و بیابان کیوں پڑی رہتی ہے؟ ایک طرف پلازہ کھڑے کے ے جاتے ہیں تو دوسری طرف جھونپڑی تک کے لیے زمین میسر نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے پانی کی کمی کا شکار ہو رہی ہے اور اس 'انسان نما' کے لیے ایک قطرہ پانی میسر نہیں آتا۔ لیکن باوجود اس ساری صورتحال کے روزانہ دریاؤں کا پانی سمندر کی نذر ہو جاتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہی 'انسان نما' ہیں۔ ان کی آبادی دنیا میں سب سے زیادہ ہے لیکن ان کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اب اگر غلطی سے دنیا میں آ ہی گئے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ 'زیادہ' انسان اور 'تھوڑے' انسان کی خدمت سرانجام دیں۔ یہی انسان نما گٹروں کے اندر صفائی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ یہ کام مشینوں سے نہیں لیا جا سکتا ہے لیکن اس سے 'انسانیت' کا وقار بلند ہوتا ہے۔ یہی 'انسان نما' دنیا میں جانوروں کی جگہ پر باندھے جاتے ہیں جو 'زیادہ' انسان اور 'تھوڑے' انسان کو اپنی منزل کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ اس سے بھی 'انسانیت' کا وقار بلند ہوتا ہے۔ کچرے کا ڈھیر ان کا ریسٹورنٹ ہوتا ہے جہاں یہ بلی کتوں کے رزق پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ غرض یہ دنیا میں 'انسانیت' کے نام پر دھبہ ہیں۔ جتنی جلد ممکن ہو انہیں دنیا سے ختم کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ دنیا کا حسن خراب کر دیں گے۔

انسان نما' سے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہیں ڈھونڈنا نہیں پڑتا یہ' ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ ہمیں فکر ہے تو' انسان نما' کی نہیں بلکہ ان کے درمیان بسنے والے ان 'تھوڑے' انسانوں کی جو ہوتے تو 'تھوڑے' انسان ہیں لیکن 'انسان نما' کی طرح ان کی بھی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ یہ تھوڑے انسان خود کو مکمل انسان سمجھتے ہیں۔ اسی مغالطہ میں اکثر مارے جاتے ہیں۔ اسی، دو سو بیس گز کا فلیٹ یا مکان حاصل کرکے یہ خود کو' انسان' سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد 'زیادہ' انسانوں کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔ 'زیادہ' انسان سے ہاتھ ملا کر، ان کے ساتھ تصویر کھنچوا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ کچھ زیادہ پڑھ لکھ جاتے ہیں تو خود کو 'زیادہ' انسان سمجھنے لگتے ہیں لیکن رہتے 'تھوڑے' انسان ہی ہیں۔

زیادہ' انسان دنیا میں بہت تھوڑے ہیں لیکن ان کی وجہ سے دنیا کا 'وقار' قائم ہے۔' اگر یہ دنیا میں نہ ہوں تو دنیا رہنے کے قابل ہی نہ رہے۔ دنیا میں رہنے کا حق صرف انہی زیادہ' انسانوں کا ہے۔ اسی لیے 'زیادہ' انسان جب عام سڑکوں سے گزرتے ہیں تو' سائرن بجائے جاتے ہیں تاکہ دوسری مخلوق اس سے دور رہے۔

زیادہ' انسان زیادہ تر امریکہ یا یورپ میں پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں' نے اپنے لیے ایک قانون بنایا ہے اور دوسری دنیا کے انسانوں کے لیے

دوسرا قانون ہے۔ گوانتاموبے کی جیل اس کی مثال ہے جہاں انسان نما کور کھا گیا۔ یہ زیادہ انسان اتنے نرم دل ہوتے ہیں کہ آپ انہیں کہیں کتے کو پالتے ہوئے دیکھیں گے، کہیں بلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھیں گے، کہیں مچھلیوں کی نسل تباہ ہونے پر غم زدہ پائیں گے۔ یہ خود کو دنیا کا اصل وارث سمجھتے ہیں اسی لیے یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کہاں کس انسان نما یا تھوڑے انسان کو ہونا چاہیے۔ دنیا کی آبادی کا کنٹرول، دولت، ذخائر، میڈیا سب ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ چاند تک پہنچ گیا ہے لیکن انسان اسے وہاں بھی نہیں ملا۔

# اُلو آخر اتنے اُلو کیوں ہوتے ہیں؟

الو کو الو کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ شاید کسی الو کو یہ بات پتہ ہو لیکن ہمیں پتہ نہیں۔ الو اتنے الو نہیں ہوتے جتنے دکھائی دیتے ہیں، پھر بھی ہم الو کو الو ہی کہتے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر الو کو الو کہا جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اب اگر الو کو الو نہ کہیں تو پھر کیا کہیں؟ الو ہوتے تو بالکل سیدھے ہیں لیکن پھر بھی ہم پتہ نہیں کیوں ہر وقت الو سیدھا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

الو کو مغرب میں عقلمندی کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن مشرق میں آتے ہی یہی الو بے وقوف بن جاتے ہیں، یا سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے اکثر مشرق کے الو مغرب میں جا کر عقلمند بن جاتے ہیں اور پھر وہ مشرق والوں کو ایسے وعظ و نصیحت کرتے ہیں جیسے خود الو نہ ہوں۔ مغرب والے الوؤں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خاص کر ایسے الوؤں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں جو ان کے کام کا ہو باقیوں کو وہ یہ کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں کہ یہ تو بالکل الو ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ مغرب کا کھلا تضاد ہے کہ وہ مغربی الوؤں کو عقلمند سمجھتے ہیں اور مشرقی الوؤں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔

الوؤں کی تعداد میں روز بروز اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے اور ہر شاخ پر الو بیٹھا نظر آتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ الو کو بھی یہ بات پتہ نہیں ہوتی کہ وہ الو ہے۔ اسی لیے جب کسی کو الو کہا جائے تو وہ سخت ناراض ہو جاتا ہے۔ الو کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اُسے کچھ سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ آپ کی بات نہیں سمجھتے اور آپ ان کی بات نہیں سمجھ سکتے۔

الو رات بھر جاگتے ہیں اور دن میں آرام کرتے ہیں اسی لیے پاکستان میں صبح کے وقت کاروبار ویران دکھائی دیتے ہیں۔ بجلی کے بحران کے باوجود یہ الو راتوں کو بجلی استعمال کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور صبح کی روشنی میں یہی الو سوئے نظر آتے ہیں۔ ان الوؤں کو سمجھانا بہت مشکل ہے اسی لیے کسی الو نے مغربی الو کی دیکھا دیکھی یہاں بھی خود بدلنے کے بجائے وقت کو بدلنے کی تجویز پر عمل درآمد کرانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ بے سود ہی ثابت ہوا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرقی الو اتنے زیادہ الو ہوتے ہیں کہ انہیں مزید الو نہیں بنایا جا سکتا۔

پاکستان میں چونکہ الو بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اسی لیے حکومت بھی الوؤں ہی کی بنتی ہے۔ یہ حکومت عوام کو الو بنانے کی کوشش کرتی رہتی ہے

لیکن جو پہلے سے الو ہو، اُسے کیسے مزید الو بنایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الو احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اپنی ہی بسیں، گاڑیاں اور املاک کو جلا کر خوش ہوتے ہیں۔

کسی الو سے پوچھا گیا کہ دہشت گردی بہت بڑھ گئی ہے۔ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے کچھ تجاویز دیں۔ انھوں نے کہا دہشت گردی میں موٹر سائیکل استعمال ہوتی ہے، اس لیے ڈبل سواری پر پابندی لگائی جائے اور اگر اس سے بھی معاملہ قابو میں نہ آئے تو موٹر سائیکل پر ہی پابندی لگا دی جائے۔ دہشت گردی میں موبائل استعمال ہوتے ہیں اس لیے موبائل سروس بند کردی جائے۔ دہشت گرد مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اس لیے مدرسوں کو فی الفور بند کردیا جائے۔ کسی الو نے اس موقع پر سوال کیا کہ اگر اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں ہو تو کیا ان پر بھی پابندی لگا دی جائے؟۔

اس سوال پر الو فرمانے لگے مانا کہ ہم الو ہیں لیکن اتنے بھی الو نہیں ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم نے گاڑیوں پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم نے انٹرنیٹ پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم نے میڈیا پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ یہ سب کام تو ہم دکھانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ ہمارے الو بھائی سمجھیں کہ ہم کچھ کر رہے ہیں اور اس طرح ہم اپنا

الو سیدھا کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اُلو بنانا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنی آسانی سے یہ سیاستدان عوام کو بناتے ہیں۔

مجھے اسکول میں ایک بار الو بنانے کے لیے کہا گیا لیکن مجھے الو بنانا ہی نہیں آتا تو کیسے بناتا۔ جب مجھ سے نہ بنا تو غصے سے کہا گیا

''کبھی الو دیکھا ہے؟''

میں شرم سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پھر کہا گیا، ''شرم سے اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟ اِدھر دیکھو''۔

ڈرائنگ میں ہمیشہ استاد سے مار پڑتی اور الو نہ بنانے پر مرغا بننا پڑتا۔ تب سے میری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ اسکول میں بچوں کو مرغا ہی کیوں بنایا جاتا ہے، الو کیوں نہیں بنایا جاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ سمجھتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے والے الو نہیں بن سکتے۔

ہمارے الو اتنے مشہور نہیں ہوسکے جتنا، الو کے پٹھے مشہور ہوئے ہیں۔ ہر الو دوسرے کو الو کا پٹھا کہہ کر مخاطب کرنا پسند کرتا ہے۔ اگر ان سے اس کا مطلب پوچھو تو کہتے ہیں ہم الو تو نہیں جو ہمیں اس کا مطلب بھی پتہ ہو۔ شاید اس کا مطلب کسی الو کے پٹھے کو ہی پتہ ہو کیونکہ وہ خود الو کا پٹھا جو ہوتا ہے۔ الو کے بچے کو الو کا پٹھا کہا جاتا ہے لیکن میں نے آج تک کسی الو کو اپنے بچے کو الو کا پٹھا کہتے نہیں سنا۔

الو پر مزاح نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے لیکن جب تک اسے الو پڑھیں گے نہیں، الو ہی رہیں گے اور ہمیں الو بننا بہت پسند ہے۔ اگر آپ کی ملاقات بھی کسی الو سے ہو تو اُسے یہ مضمون ضرور پڑھوایئے گا اسے ضرور پسند آئے گا۔

# نو سو چوہے 'حج' پر گئے

سنا ہے جب سے چوہوں کے دام لگے ہیں، چوہوں نے بلوں میں پناہ لے لی ہے، لیکن کیا کریں ان کی خبریں وقت بے وقت پتہ نہیں کیوں 'لیک' ہو جاتی ہیں۔ جبکہ ایک بھی چوہا کسی کے ہتھے نہیں چڑھتا۔ چوہوں کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے، کھا کھا کر موٹے ہوئے جاتے ہیں لیکن کھانا پھر بھی نہیں چھوڑتے۔

کچھ چوہے تو اتنا کھا جاتے ہیں کہ ان کا زمین پر آزادی سے چلنا پھرنا دوبھر ہو جاتا ہے اور نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ ان کا ملک سے باہر جانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر انہیں باہر نکلنے کے لیے پتلا ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آپ ان کو پکڑنے کے لیے کتنے بھی جتن کرلیں، چاہے نیب لگالیں، یہ کسی کے ہاتھ آسانی سے نہیں آتے۔

چوہوں کو پکڑنے یا ڈرانے کے لیے پہلے بلی کو گھر میں رکھا جاتا تھا لیکن آج کل چوہوں کو رکھا جاتا ہے۔ یہ پلے ہوئے چوہے بلی سے کسی طور کم دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لیے بلی بھی ان کے آگے دُم ہلاتے دکھائی دیتی ہے۔ یہ چوہے اتنے تیز ہو گئے ہیں کہ ان کو مارنے کے لیے زہر بھی رکھا جائے تو یہ اسے منھ تک

نہیں لگاتے۔ بلکہ اکثر کھانے کو زہریلا کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ پتا نہیں یہ چوہے جس تھیلی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کیوں کرتے ہیں؟

ایک روز بلی سے پوچھا گیا کہ وہ چوہے کیوں نہیں پکڑتی؟ کہنے لگی جب چوہوں کی طرف سے کھانے کو مل رہا ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے اُن کا نمک حرام کرنے کی۔ تو پھر اس سے مالک کا جو نمک حرام ہو رہا ہے بلکہ جینا حرام ہو رہا ہے اس کا کیا؟ کہنے لگی مالک کے نمک پر بھی چوہوں کا قبضہ ہے، جب مالک نے خود گھر کا کچن چوہوں کے حوالہ کر رکھا ہو تو پھر ایسے میں بلی بیچاری کیا کرے؟ بھیگی بلی ہو گی تو کھمبا ہی نوچے گی۔

آج کل کے چوہے خود کو شیر سمجھتے اور کہتے بھی ہیں۔ بڑی دیدہ دلیری سے شہر کی سڑکوں پر وی وی آئی پی پروٹوکول میں دندناتے پھرتے ہیں اور کسی کو اپنا دیدار بھی نہیں کراتے۔ عوام سے ڈرتے ہیں بے چارے، آخر کو چوہے جو ہوئے۔ انہیں تو سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے لیکن کیا کریں، شیر ہوتے تو کب کے چڑیا گھر میں ہوتے لیکن اب یہ ٹھہرے چوہے، بھلا چڑیا گھر میں ان کے لیے کوئی پنجرہ جو نہیں ہے، اسی لیے آزادی سے گھوم رہے ہیں۔ جب دل چاہتا ہے خود ہی چڑیا گھر کی سیر کو چلے جاتے ہیں اور وہاں کی تازہ ہوا کھا کر پھر سے اپنے کاروبار پر واپس آ جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اب بھلا قاضی جی ان چوہوں کو سبق تھوڑا ہی پڑھاتے ہیں اور پھر چوہے کیوں سبق لینے لگے؟ وہ تو الٹا ہمیں سبق سکھاتے ہیں لیکن ہم ان سے سبق لینے کے لیے تیار نہیں۔ ان سیانے چوہوں کی تلاش میں مدرسوں میں چھاپے بھی مارے گئے لیکن چوہے پھر بھی ہاتھ نہ آئے۔

ایک چوہا کہتا تھا کہ میں ڈرتا ورتا کسی سے نہیں لیکن آج کل سنا ہے وہ چوہا ملک سے باہر بھاگا ہوا ہے۔ لوگ اسے بلا سمجھتے تھے لیکن وہ چوہا نکلا۔ اسے بلا سمجھ کر دودھ کی رکھوالی کے لیے رکھا گیا تھا لیکن اس نے سارے چوہوں کو بلا کر بھان متی کا کنبہ جوڑا اور سارا دودھ ان چوہوں کے حوالے کر دیا۔ اب وہ دودھ کے دھلے چوہے اپنی اپنی دُم چھپاتے پھر رہے ہیں۔ بلی نے نو سو چوہے کھا کر حج پر جانا تھا لیکن اب نو سو چوہے حج پر جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا لیکن یہاں تو پہاڑ کے پہاڑ کھودنے کے بعد بھی چوہا نہیں نکلتا۔ آج کل چوہے پہاڑوں میں نہیں رہتے بلکہ عالیشان محلات میں رہتے ہیں۔

پاکستانی چوہوں کی دیدہ دلیری دیکھ کر بھارت سے بھی کچھ چوہے ادھر آ نکلے تھے، لیکن ایک چوہے کو پکڑا تو اس نے سب چوہوں کے نام

اگل دیے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ چوہوں کی بھی حدود ہوتی ہیں اور اگر وہ حدود سے تجاوز کریں تو انہیں پکڑنا پڑتا ہے ورنہ طاعون جیسی موذی بیماری جنم لیتی ہے جس سے نجات بھی ممکن نہیں۔

نو سو چوہے ملک کو کھانے میں لگے ہوئے ہیں اور ساتھ چوہے بلی کا کھیل بھی کھیلا جا رہا ہے۔ پاکستانی عوام ایک عرصہ سے یہ چوہے بلی کا کھیل دیکھ دیکھ کر بیزار آ چکے ہیں۔ اب وہ چاہتی ہے کہ یہ کھیل بند کیا جائے اور کوئی نیا کھیل شروع کیا جائے، تو جناب نیا کھیل بھی شروع ہونے ہی والا ہے، دیکھتے رہیے کہیں مت جایئے گا۔

# اندھا قانون، قانون کے ہاتھ

جنگل کا بھی ایک قانون ہوتا ہے اسی طرح ہمارے ملک میں بھی ایک قانون ہے۔ اس قانون کی حفاظت کے لیے کچھ لوگوں کو رکھا جاتا ہے جنہیں قانون نافذ کرنے والے ادارے چلاتے ہیں۔ ان کو اس کام کے لیے ایک وردی دی جاتی ہے لیکن کچھ میرؔ کی طرح اتنے 'سادہ' ہوتے ہیں کہ انہیں کسی وردی کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ وہ چلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے قانون چل رہا ہے۔

ہمارے ملک میں قانون نافذ کرنے والوں کو بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ یہی قانون کی ضمانت ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو قانون ہی ختم ہو جائے۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ اپنی ذات میں خود مکمل قانون ہوتے ہیں۔ کالے کوٹ والے اکثر اسی بات پر کالی وردی والوں سے خاص کر الجھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب انہیں یہ بات کون سمجھائے کہ قانون کو قانون نہیں پڑھایا جا سکتا۔ اگر قانون ہی پڑھنا ہوتا تو وہ کالا کوٹ نہ پہنچ لیتے۔

ہر قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اپنے اپنے فرائض ہیں لیکن یہ لوگ اپنے

فرائض سے بڑھ کر کام کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ جہاں یہ لوگ کھڑے ہوں وہیں یہ قانون سمجھے جاتے ہیں۔ان کی وردی کسی بھی رنگ کی ہو لیکن اگر سڑک پر ہاتھ دے دیں تو ٹریفک رُک جاتی ہے کیونکہ قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اختیار ہے کہ یہ آپ کی جامہ تلاشی سے لے کر شناختی کارڈ تک سب کچھ چیک کر سکتے ہیں۔ اگر آپ گاڑی پر ہیں تو گاڑی کے کاغذات سے لے کر لائسنس تک ہر چیز طلب کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے پاس سوال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ سوال کے درست جوابات اگر انہوں نے تعلیمی اداروں میں دیئے ہوتے تو آج یہ کام نہ کرتے۔ انہیں یہ عادت بچپن سے ہی ہوتی ہے کہ یہ کسی سوال کا جواب نہیں دیتے کیونکہ سوال کا جواب دینا یہ اپنی توہین سمجھتے ہیں اور توہین قانون کبھی برداشت نہیں کرتا۔ اگر یہ سڑک سے گزر رہے ہیں تو عوام کا فرض ہے کہ وہ ان کو راستہ دیں کیونکہ قانون ان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ نے ان کو راستہ دینے میں تاخیر کی تو آپ قانون کے راستہ میں رکاوٹ سمجھے جا سکتے ہیں اور قانون اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹانا جانتا ہے۔

پاکستان سے باہر ٹریفک پولیس والے گاڑی سے اتر کر گاڑی والے کے پاس جاتے ہیں اور پھر ہاتھ ملا کر چالان کرتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں چونکہ قانون نافذ کرنے والوں کا بے حد احترام پایا جاتا ہے اسی لیے عوام خود اتر کر ان کے پاس جاتی ہے اور ہاتھ گرم کرکے چالان نہ کرنے کی اپیل کرتی ہے جو اکثر رحم دل قانون نافذ کرنے والے موقع پر ہی منظور کرکے قانون کو مزید الجھنوں

سے بچا لیتے ہیں۔ یوں معاملات موقع پر ہی رفع دفع کر لیے جاتے ہیں۔

کالی وردی والے اکثر سڑک کے کنارے اندھیرے میں کھڑے ہو کر جرم کی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ہر آتے جاتے کو دیکھ کر اندازا لگا لیتے ہیں کہ مجرم کون ہے۔ مجرم ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے لیکن یہ مجرم کے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہیں۔ انہیں عوام سے شکایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتی۔ اگر وہ بھی تعاون کریں تو معاملات تھانہ تک پہنچے سے پہلے ہی ختم کیے جا سکتے ہیں۔

گزشتہ کچھ عرصہ قبل شہر کے چوک چوراہے اور گلیاں جنگ کا منظر پیش کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ عوام نے قانون اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بیریئر لگا کر راستے بند کر رکھے تھے۔ یہ کام تو قانون نافذ کرنے والوں کا تھا لیکن عوام نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ آج کل یہ بیریئر آپ کو صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں کے باہر دکھائی دیں گے۔ اس سے اندازا ہوتا ہے کہ اگر خطرات لاحق ہیں تو وہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کو ہیں جن کو سیکورٹی کی اشد ضرورت ہے۔ عوام کا فرض ہے کہ وہ قانون نافذ کرنے والوں کی سیکورٹی کو یقینی بنائیں۔

دہشت گردی کی جنگ میں قانون نافذ کرنے والوں کی قربانیاں لازوال ہیں۔ انہوں نے کسی کو بھی قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لینے دیا کیونکہ قانون کو اپنے ہاتھ میں رکھنا صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں کا کام ہے۔ کہتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے اسی لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے تاکہ قانون بھٹکنے نہ پائے۔ قانون نافذ کرنے والے قانون کو راستہ دکھاتے ہیں کہ قانون کو کس طرح اپنا راستہ بنانا ہے۔

قانون اندھا ہے اس لیے اس پر کچھ لکھنا بھی گویا قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے اور ہمیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا بالکل بھی پسند نہیں اس لیے قانون کے ساتھ مذاق بالکل بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے قانون کو یہی ختم کرتے ہیں۔

☆.....☆

# حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لکھنے والے لکھ رہے ہیں اور پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں۔ پڑھنے والے بھی وہی کچھ پڑھ رہے ہیں جو وہ پڑھنا چاہتے ہیں اور لکھنے والے بھی وہی کچھ لکھ رہے ہیں جو وہ پڑھانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں کس طرح لکھنے اور پڑھنے کا اصل حق ادا ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد ہی تعصب پر رکھی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آپ اس لیے پڑھ رہے ہوں کہ جانیں کہ ہمارا مخالف کیا کہتا ہے اور ایسا بھی بہت کم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مخالف کی تعریف کرنے کیلئے قلم اٹھائیں اور اپنی جماعت کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا کا اسٹیج ڈرامہ دیکھ رہے ہیں جس میں ایک ہیرو ہے جس سے کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہوتی اور دوسرا ولن ہے جو غلطیوں کا پتلا ہے۔

ایک شخص چلتے ہوئے اچانک کیلے کے چھلکے سے پھسلا اور فٹ پاتھ پر جا گرا۔ اس واقعہ کو دیکھنے والے مختلف لوگوں نے مختلف تاثرات کا اظہار کیا۔ ایک شخص نے یہ دیکھ کر بھرپور قہقہہ لگایا اور ہنس دیا۔ دوسرے شخص نے اس کے گرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ تیسرے شخص نے سوچا کہ یہ کس شخص نے ایسی جگہ کیلا گرایا ہے جس کی وجہ سے اس شخص کو تکلیف پہنچی۔ اسی طرح ایک شخص نے سوچا کہ

اگر یہ شخص آنکھیں کھول کر چلتا تو کبھی اس طرح نہ گرتا۔ غرض واقعہ ایک ہی تھا لیکن سوچنے کا انداز جدا جدا تھا۔

یہ ایک مثال ہے کہ سوچنے والا کسی کو مورد الزام بھی دے سکتا ہے، کسی پر ہنس بھی سکتا ہے، کسی پر رو بھی سکتا ہے اور کسی کو حل بھی پیش کر سکتا ہے کہ پھر ایسا نہ ہو۔

یہی کام ایک قلمکار کا ہے جو لوگوں کو مشکلات سے نکالنے کیلئے حل پیش کرتا ہے۔ منفی سوچ، محرومی اور جہالت کے تاریک اندھیروں میں امید کی کرن پیدا کرنا ہی اصل میں ایک قلمکار کا فریضہ ہے۔ اگر آپ کو اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تو برائے مہربانی آپ دوسروں کو گمراہ نہ کریں۔

زندگی میں جہاں خوشی ہے وہیں غم بھی ہیں۔ جہاں اندھیرا ہے وہیں روشنی بھی ہے۔ گزر جانے والے وقت کو نہ دیکھیں آنے والے وقت کی فکر کریں۔

جو نہ مل سکا اسے بھول جا

اسے یاد رکھ جو تیرے پاس ہے

آج جب میں میڈیا پر خبریں دیکھتا ہوں، اخبارات پر تبصرے پڑھتا ہوں تو مجھے اس وقت بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خبر کا معیار یہ نہیں کہ اس کو

پیش کرنا کیسا ہے؟ بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ کتنے لوگ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کئی بڑے بڑے چینلز اور کالم نگار صرف ایسا آئینہ بن کر رہ گئے ہیں اور جو عوام کو وہی کچھ دکھا رہے ہیں جو عوام خود خوش قسمتی یا بد قسمتی سے دیکھ نہیں پا رہی۔ چار لاکھ کی آبادی میں ایک شخص قتل ہو گیا تو یہ خبر پیش کر دی گئی اور ایک شخص مرنے سے بچ گیا تو کوئی خبر نہیں بنی۔ یا ممکن ہے اس شہر میں کوئی شخص مرنے سے بچتا ہی نہ ہو۔ کم از کم میڈیا کی خبروں سے تو ایسا ہی تاثر پیدا ہوتا ہے۔

میرے پسندیدہ قلمکار نویس بھی کبھی کبھی ایسا کالم لکھتے ہیں کہ جسے پڑھ کر سر پیٹنے یا ہنسنے کا دل چاہتا ہے۔ لیکن میں نہ سر پیٹتا ہوں اور نہ ہی ہنستا ہوں کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ بھی ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔ وہ بھی حالات سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ زیادہ متاثر ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ پھر ایسے میں جبکہ اس کا روزگار ہی قلم سے وابستہ ہو تو اسے لامحالہ لکھنا ہوتا ہے اور پھر اس کا قلم وہی لکھتا ہے جسے نہیں لکھنا چاہیے اور ہم صرف اس بنیاد پر اسے پڑھتے ہیں کہ شاید اسے پڑھ کر تاریکی میں اجالا مل سکے گا۔

اگر آپ نیک نیتی سے سوچیں تو دنیا کا کوئی کام بدنیتی پر مبنی نہیں ہوتا۔

نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس لیے ہم کون ہوتے ہیں کسی کی نیت پر شک کرنے والے۔ کوئی بھی شخص برا کام اس لیے نہیں کرتا کہ وہ برا ہے بلکہ اس لیے برا کرتا ہے کہ یا تو اسے برائی کا پتہ نہیں ہے یا پھر وہ اچھائی سے ابھی تک ٹھیک سے واقف نہیں ہو پایا۔

لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ دیانتداری سے ہر رخ کا جائزہ لے کر اپنے قاری کو پیش کرے اور پھر کسی سدھار کی صورت پیش کرے اور یہی کام ایک قاری کا بھی ہے کہ وہ تعصب سے بالاتر ہو کر کسی کو شیطان اور کسی کو فرشتہ سمجھنا چھوڑ کر کھلے دل سے ہر موقف کو عقل و دل کی کسوٹی پر پرکھے۔ پھر فیصلہ کرے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط؟ جو منہ میں آئے وہ بول دینا بہت آسان ہے لیکن بہتر ہو گا کہ زبان چلانے سے پہلے اسے عقل کی کسوٹی پر تول بھی لیا جائے ورنہ جس قلم کی قسم قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے اس کا کبھی بھی حق ادا نہیں ہو گا۔

# پانامہ کا پاجامہ اور لوٹ سیل

رانا ثناءاللہ نے پاناما لیکس کو پاجامہ لیکس قرار دیا ہے اور شیخ رشید کہتے ہیں کہ اگر یہ "
"پاجامہ لیکس ہیں تو حکومت کو بہت جلد پیمپر کی ضرورت پڑے گی۔
پانامہ کا پاجامہ ڈرائی کلین ہونے جا رہا ہے، اب سب پتا چل جائے گا کہ کس کس نے "
"یہ پاجامہ پہنا تھا۔
ڈرائی کلینرز کا کام کلین کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی داغ یا دھبہ لگ جائے تو یہ ڈرائی کلینز "
" سب داغ صاف کر دیتے ہیں۔
لیکن یہ پاجامہ ہے کس کا، کس نے پہنا ہے یہ پاجامہ اور پھر کون لایا ہے یہ پاجامہ، "
"کس نے پہنایا ہے یہ پاجامہ ؟ ان سب سوالوں کا جواب کون دے گا؟
"یہ سب شور ہے جو بہت جلد آف شور ہو جائے گا۔ "
"لیکن یہ شور تو شروع ہی آف شور سے ہوا ہے اب اسے آف کرنا ممکن نہیں ہوگا۔"
تم بھی کتنے بھولے ہو، آج تک کوئی کرپشن یہاں ثابت ہوئی ہے جو یہ ہوگی۔ رائے "
ونڈ کے سرے محل سے لے کر سوئس اکاؤنٹس تک جتنے بھی کیس ہیں سب جھوٹے ہیں۔
"

"اس کا مطلب ہے ہمارے ملک میں کرپشن نہیں ہوتی صرف اس کا شور ہوتا ہے۔ "
اور شور بھی ایسا جس میں چور بھی مچاتا ہے شور اور پتا ہی نہیں چلتا کہ "

''چور کون ہے ؟

''اگر سب شریف ہیں تو پھر بدمعاش کون ہے؟ ''

'' جس کے پاس معاش نہیں ۔''

''اور جس کے پاس معاش ہے وہ 'زرداری' بنا ہوا ہے۔ ''

''اب انصاف کا وقت آگیا ہے کہ لوٹی ہوئی رقم واپس لی جائے۔''

مسئلہ یہ ہے کہ انصاف جس نے کرنا ہے وہ تحریکِ انصاف میں نہیں ہے۔اسی لیے''

'' تحریکِ انصاف میں صرف تحریک ہی رہ گئی ہے۔

انصاف کرنے والے کہتے ہیں کہ جو کرپشن نہیں کرنا چاہتا وہ نہ کرے اور جو کرپشن''

''کرے گا اس سے اللہ پوچھے گا۔

میرے خیال میں تو ہمارے بڑوں کو اس مسئلہ پر گنجائش پیدا کرنی چاہیے کیونکہ کرپشن ''

''کے بغیر جمہوریت نہیں چل سکتی۔

''اسی لیے سارے اپوزیشن کے لیڈران مل کر اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں ۔''

''کرپشن سے جمہوریت تو چل جائے گی لیکن ملک نہیں چلے گا۔ ''

''ملک کو تو چلانا ہوگا ورنہ یہ سب لوگ کہاں سے کھائیں گے ؟''

اس کے لیے سب کو مل بانٹ کر کھانا ہوگا اور اپنی اپنی باری کا انتظار کرنا ہوگا۔ اب ''

''ملک اس لڑائی جھگڑوں اور دھرنوں کا مزید متحمل نہیں ہو سکتا۔

حکومت نے بھی اسی لیے سختی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اب دھرنوں کی اجازت نہیں''

''دیں گے۔

کاش یہ کہتے کہ ہم کرپشن کی بھی اجازت نہیں دیں گے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان سے ''

''اجازت لیتا کون ہے۔

اگر یہ کھیل اسی طرح جاری رہا تو پھر انہیں بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی جو بغیر ''

''اجازت آتے ہیں اور پھر جاتے ہی نہیں۔

اب کوئی بھی آئے کوئی بھی جائے عوام کو اس کی کوئی پروا نہیں وہ تو بس یہی کہہ رہی ''

''ہے داغ تو چلا جائے گا لیکن یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔

اور ویسے بھی داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔ داغ نہیں تو سیاست نہیں اور سیاست نہیں تو ''

''کرپشن نہیں اور کرپشن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

''تو پھر چلو ہم بھی چل کر لنڈے سے پاجامہ خریدتے ہیں پانامہ تو جا نہیں سکتے۔ ''

''!!......چلو''

☆......☆

# عوام کے لیے تمام راستے بند ہیں

کہنے کو تو جمہوریت ہے اور عوام کی حکومت ہے لیکن عوام کا نام حکومت میں بطور تبرک استعمال کیا جاتا ہے۔ عوام کی مشکلات کا ذکر تسبیح کے دانوں کی طرح کیا جاتا ہے لیکن اس پر توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ خود کو عوام کا نمائندہ اور خادم کہتے ہیں لیکن یہ ان کے درمیان رہنا پسند نہیں کرتے اور جب کبھی یہ اتفاق سے ان کے درمیان سے گزریں تو سیکیورٹی کے نام پر عوام کا راستہ بند کر دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان چند وی آئی پیز کے لیے بنایا گیا تھا کیونکہ ان کے راستے میں آنے والی تمام رکاوٹیں ہٹا کر عوام کے راستے میں لگا دی جاتی ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح ان کو کوئی تکلیف نہ ہو چاہے عوام کو گھنٹوں ٹریفک میں انتظار کرنا پڑے۔ جب پاکستان کے آئین کے مطابق ہر شخص کو مساوی اختیارات حاصل ہیں تو پھر ایسا کس قانون کے تحت ممکن ہے؟ شاید یہ بات آئین کا حلف اٹھانے والے ہی بہتر جانتے ہوں یا اس کی تشریح کرنے والے بہتر سمجھتے ہوں گے۔ لیکن بہرحال عوام کو تو سرخ بتی کا احترام کرنا ہے چاہے ان کے حکمران اس کا احترام کریں یا نہ کریں۔

پاکستان کے بانی قائدِ اعظم اپنے اصولوں اور قاعدوں کے اس قدر پابند تھے کہ

انھوں نے کبھی اس پر سودے بازی نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پاکستان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن بد قسمتی دیکھیے کہ کراچی کے ڈرگ روڈ پر بنا پھاٹک ان کے انتقال کی وجہ بنا۔ کیا ان سے بڑا کوئی وی آئی پی ہو سکتا تھا جس کے لیے پھاٹک بند نہ کیا جاتا۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے لیے اضافی اختیارات استعمال نہ کیے۔

کراچی ڈرگ روڈ شاہراہ فیصل پر بنا پھاٹک آج تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن یہاں سے گزرنے والے آج بھی اسی طرح خود کو بے بس و لاچار محسوس کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہاں بنایا جانے والا پل ہے جو اپنی نااہلی اور ناقص منصوبہ بندی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ یہ پل متعدد بار مرمت کیا جا چکا ہے لیکن تاحال اس پر گڑھے موجود ہیں جو کسی بڑے حادثہ کا سبب بن سکتے ہیں۔ ایک طرف ڈرگ روڈ کا اسٹیشن اور دوسری طرف کنٹونمنٹ ایریا ہے جس کے بیچ سے شارع فیصل کی سڑک اپنی تنگ دامنی کے ساتھ یہاں سے گزرتی ہے۔ جس میں سے اٹھنے والا پل اس کی تنگ دامنی کو مزید تنگ کرتا ہے۔ ایئرپورٹ سے آنے والی ٹرانسپورٹ گاڑیاں ڈرگ روڈ اسٹیشن کے اسٹاپ پر اپنی سواریاں اتارنے اور چڑھانے کے بعد سڑک کے ٹریفک کو کاٹتی ہوئی اس پل پر چڑھتی ہیں جس سے ٹریفک مزید جام ہوتا ہے۔ یہ پل صرف ایئرپورٹ سے آنے والے ٹریفک کو گلستان جوہر کی طرف جانے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن گلستان جوہر سے آنے والی ٹریفک کو پھر بھی شاہراہ فیصل پر

آنے کے لیے سگنلز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسی طرح شاہراہ فیصل کی ٹریفک کو بھی یہاں رکنا پڑتا ہے۔

کراچی کی حدود اور آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی تھی اس کے لیے ویسی ہی منصوبہ بندی کی بھی ضرورت تھی لیکن بدقسمتی سے کراچی کو اپنا کہنے والوں نے کبھی ایسی منصوبہ بندی نہیں کی کہ مستقبل میں آنے والے چیلنجز کا سامنا کیا جاسکتا۔ لہٰذا ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے ایسے پل ڈیزائن کئے گئے جو گزرتے وقت کے ساتھ بجائے آسانی پیدا کرنے کے عوام کے لیے مزید مشکلات کا سبب بن گئے۔

کراچی کے پیش آمدہ چیلنجز کا درست ادراک کرتے ہوئے سب سے پہلے سابق میئر نعمت اللہ خان نے کراچی کے لیے میگا پروجیکٹس کی بنیاد رکھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سڑکوں کو فری کوری ڈور بنانے کی طرف کام کا آغاز کیا گیا۔ جسے سابق میئر مصطفیٰ کمال نے بھی جاری رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی کو اس مختصر عرصے میں اتنے پل مل گئے کہ جو کراچی کی تاریخ میں کبھی نہ بنے تھے۔

شاہراہ فیصل کو کراچی کی سب سے اہم شاہراہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ وی آئی پیز کی گزرگاہ ہے جہاں سے یہ لوگ ایئرپورٹ روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس شاہراہ

پر تاحال تین سے چار سگنلز موجود تھے۔ جن کو حال ہی میں ختم کیا گیا ہے لیکن اس کے لیے متبادل روٹس پر کام نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے عوام کو پریشانی کا سامنا ہے۔

ایئرپورٹ کی طرف جانے والی شاہراہ جب ناتھا خان پل کے قریب پہنچتی ہے تو یہاں سے ڈرگ روڈ جانے والے دائیں طرف مڑتے تھے جسے بند کر دیا گیا ہے۔ یوں ڈرگ روڈ جانے والی ٹریفک کو متبادل کے طور پر شاہ فیصل کا پل استعمال کرنا پڑتا ہے جو انتہائی دور ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہاں ٹریفک جام ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ایئرپورٹ اسٹار گیٹ کا راستہ بھی بند کیا گیا ہے جس کا متبادل بظاہر قریب ہی ایئرپورٹ کے نیچے سے یوٹرن ہے لیکن یہاں بھی ڈرگ روڈ والے مسائل درپیش ہیں کیونکہ ٹریفک کے دباؤ کے برخلاف سڑک کا گھیراؤ یوٹرن سے تنگ ہے اور پھر آگے چل کر سڑک پر بے جا پارکنگ اور سڑک ناقص ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں بھی ٹریفک جام کا شدید سامنا ہے۔ جو وقت سگنل پر رکنے کے لیے بچایا گیا تھا وہ اب یہاں وقت کے ساتھ ساتھ ایندھن کی صورت میں بھی خرچ ہو رہا ہے۔ شاہراہ فیصل پر سفر کرنے والے کو اگر کسی ایمرجنسی کی صورت میں واپس لوٹنا پڑے تو اسے بہت دور تک واپسی کا راستہ نہیں ملتا جو بھیانک صورتحال ہے۔ اگر سڑک کے دونوں اطراف سروس روڈ ہوتی تو شاید یہ مسئلہ اتنا گھمبیر نہ بنتا لیکن ایسا نہیں جس کی وجہ سے عوام کو مشکلات کا سامنا

ہے۔ اسی طرح اگر ایئر پورٹ سے آپ ملیر کینٹ کی طرف جائیں تو یہاں بھی ماڈل کالونی کی طرف جانے والی سڑک کو بند کر دیا گیا ہے اور متبادل کے لیے ایئرپورٹ قبرستان سے ملیر کینٹ تک کوئی دوسرا راستہ نہیں دیا گیا۔

کراچی جیسے بڑے شہر میں کہیں بھی جانے کے لیے گوگل میپ کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن دیکھنے میں آ رہا ہے کہ اب گوگل بھی ان بند راستوں کو سمجھنے سے قاصر ہے جنہیں رکاوٹیں لگا کر صرف عوام کے لیے بند کیا گیا ہے۔ ان بند راستوں نے عوام کو مخالف سمت میں سفر کرنے پر مجبور کر دیا ہے جس سے حادثات اور ٹریفک کے مسائل مزید پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اگر حکومت عوام کی ہے تو عوام یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ پھر ان کی مشکلات میں روز بروز اضافہ کیوں کیا جاتا ہے اور انہیں کون دور کرے گا؟ ڈرگ روڈ کے عوام نے سب سے پہلے اس مسئلہ پر آواز بلند کرتے ہوئے شاہراہ فیصل پر احتجاج کیا ہے جس پر اگر کان نہ دھرا گیا تو یہی عوام جو حکمرانوں کو سر پر بٹھائے ہوئے ہے انہیں عرش سے فرش پر لانے میں دیر نہیں کرے گی۔ پھر وہ دن بھی دور نہیں جب عوام کے راستے بند کرنے والوں کے بھی راستے بند کر دیئے جائیں پھر کسی کو بھی ایگزٹ کا راستہ نہیں ملے گا۔

# سقوط ڈھاکہ تو اب ہوا ہے

میں کیسے لکھوں اور کیوں کر لکھوں کہ آج میرا قلم بھی لکھنے میں میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ جذبات یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ احساس کی تو کوئی بھی زبان نہیں ہوتی۔ تم لکھوگے تو کون سی زبان میں لکھوگے؟ اور پھر اگر تم لکھ بھی لو تو بھی اسے کون سمجھ پائے گا۔ پھر اچانک اندر سے آواز آئی کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے تمہیں لکھنا ہے کہ تمہارا فرض لکھنا ہے۔ پھر میں نے اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں جمع کرکے ایک ہی جملہ لکھا جس کے بعد میرا قلم چل نکلا اور وہ تھا..... سقوط ڈھاکہ تو اب ہوا ہے۔

میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں اور میں نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ 16 دسمبر 1971ء میں پاکستان دولخت ہوا اور جسے سقوط ڈھاکہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پاکستان ایک ملک ہی نہیں بلکہ ایک نظریہ تھا جس کو ختم کرنے کی ایک نہیں بلکہ کئی بار کوششیں کی گئیں لیکن اسے دولخت کرکے بھی ختم نہ کیا جا سکا۔

آج بنگلہ دیش کو وجود میں آئے 44 سال ہونے کو آرہے ہیں لیکن اس نظریہ کو بار بار پھانسی دے کر بھی کچلا نہیں جا سکا۔ نظریہ پاکستان کا ساتھ دینے کے جرم

میں پھانسی پانے والوں میں عبدالقادر ملا، قمرالزماں چوہدری، پروفیسر غلام اعظم، علی احسن مجاہد کے بعد اب جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے امیر مطیع الرحمٰن نظامی بھی شامل ہو گئے۔ یہ وہ نظریہ پاکستان کے سپاہی تھے جنہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے اور نہ ہی اپنے نظریات پر کوئی سودے بازی کی، کوئی رحم کی اپیل دائر نہیں کی..... سولیوں پر جھول گئے لیکن ماتھے پر کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی..... کیونکہ یہ نیازی تھے اور نہ ہی کمانڈو تھے۔ لیکن نظریہ پاکستان کا حلف اٹھانے والے نظریہ پاکستان کیا جانیں۔ پاکستان کو دو لخت تو کیا جاسکتا ہے لیکن نظریہ کو پھانسی کے ذریعے ختم نہیں کیا سکتا۔

مطیع الرحمٰن کی پھانسی صرف ایک فرد کی پھانسی نہیں ہے بلکہ 57 اسلامی ملکوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اس پھانسی نے اقوام متحدہ، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور نام نہاد انسانی حقوق کے اداروں کو بھی بے نقاب کردیا ہے۔ معاملہ اسلام کا ہو تو یہ اسی طرح منہ چھپائے بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے آج بنگلہ دیش کی حکومت سے کوئی گلہ ہے اور نہ ہی پاکستان کی حکومت سے ہے۔ مجھے تو بس گلہ ہے اپنی اسلام پسند عوام سے کہ جنہوں نے پاکستان بنایا تھا اور اس کے لیے ان کے باپ دادا نے قربانیاں دیں تھیں۔ اپنی عوام کی بے حسی اور خاموشی کو دیکھ کر مجھے آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے واقعی سقوط ڈھاکہ تو اب ہوا ہے۔

پتا اب اس کا بدل گیا ہے

وہ جسم و جاں سے نکل گیا ہے
کوئی جو پوچھے کہاں ملے گا
کہو کہ 'جنت محل' گیا ہے
(نجیبؔ ایوبی)

# بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکثر والدین کو اپنے بچوں سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ پڑھتے نہیں۔ اپنے بڑوں کا ادب نہیں کرتے۔ اپنا وقت ٹی وی، کمپیوٹر یا موبائل کے گیم اور کارٹون دیکھ کر گزار دیتے ہیں اور اپنی آنکھیں خراب کرتے ہیں۔ ان کی زبان بھی روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ اخلاقیات تو گویا ان کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ نہ ادب سے واقف ہیں اور نہ ہی آداب سے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔

شکایات کی ایک طویل فہرست ہے جن کا یہاں احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کرنا مقصود ہے۔ بچے ہم سب کی ذمہ داری ہیں کیونکہ یہی پاکستان کا روشن مستقبل ہیں۔ یہ وہ کورا کاغذ ہیں جن پر ہم نے اپنا مستقبل کا نقشہ تعمیر کرنا ہے۔ بچے ہمارا عکس بھی ہیں کہ یہ ہمیں دیکھ کر سیکھتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی ذمہ داریوں سے یہ کہہ کر عہدا برا ں نہیں ہو سکتے کہ دوسروں نے اپنا حق ادا نہیں کیا۔

والدین اس معاملے میں اکثر اساتذہ کو قصوروار سمجھتے ہیں کہ ہم بچوں کو

بہترین اسکولز میں اس لیے داخل کراتے ہیں کہ بچے کچھ تعلیم و تربیت سیکھیں لیکن اساتذہ بھاری فیس تو لیتے ہیں مگر تعلیم نہیں دیتے۔ اساتذہ کا کہنا ہے کہ بچہ ہمارے پاس صرف 5 تا 6 گھنٹے ہوتا ہے باقی وقت وہ گھر میں گزارتا ہے۔ لہٰذا ان کی ذمہ داری اتنی نہیں بنتی۔ میرا مقصد یہاں ذمہ داریوں کا تعین کرنا بھی نہیں کہ کس کی کتنی ذمہ داری بنتی ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اس سارے معاملے میں بچے اس حد تک متاثر ہوئے ہیں کہ بقول اکبر الہ آبادی یہ کہنا پڑتا ہے

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ کے بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ہماری نصاب کی کتب کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ کتابوں کا ایک ڈھیر ہے جو ایک گدھے پر لاد دیا گیا ہے کہ جسے اٹھا کر گدھا عالم نہیں بنتا۔ ہمارے ایک استاد ہمیں اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ تم اپنے ذہن میں پوری دنیا کا علم نہیں سمو سکتے، تم پوری ڈکشنری حفظ نہیں کر سکتے لیکن تم اپنے اندر پڑھتے رہنے کی صلاحیت پیدا کرو۔ اس سے تم دورہ حاضر سے آگاہ بھی رہو گے اور تم تاریخ سے بھی واقف ہو جاؤ گے۔ تمہیں پڑھتے رہنا ہوگا اور سیکھتے رہنا ہوگا کیونکہ جو ایسا نہیں کرے گا وہ علم کی دوڑ میں پیچھے رہ

جائے گا۔

اسکول کے نصاب کا مقصد بچوں کو علمی کی بنیادیں فراہم کرنا ہونا چاہیے۔ لیکن ہم نے چاہا کہ دنیا بھر کا علم بچے کو نصاب کی صورت گھول کر پلا دیں جس سے ہوا یہ کہ جو گلاس میں پانی تھا وہ بھی چھلک گیا اور پڑھنے سے نفرت اور بیزاری نے جنم لیا۔ اگر ہم تعلیمی نصاب میں کتابوں کو کم کریں اور بچوں میں مطالعہ کی عادت پیدا کریں تو شاید ہم اس کا کسی حد تک ازالہ کر سکتے ہیں جو ہم نے کتاب سے دوری پیدا کرکے حاصل کیا ہے۔

بچوں میں ادب کو پروان چڑھانے کے لیے اسکولز میں نہ صرف لائبریریز کا قیام عمل میں لانا ہوگا بلکہ ان کو اس طرف راغب بھی کرنا ہوگا کہ وہ خود انھیں اپنی مرضی سے پڑھے۔ بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی بچوں کے رسائل اور کتابیں نہ صرف لا کر دیں بلکہ انہیں پڑھ کر سنائیں اور خود بھی سنیں۔ سوتے وقت ایک کہانی روزانہ پڑھ کر سنائیں۔ ہم بچوں کے مستقبل کے لیے ہر وقت فکر مند رہتے ہیں لیکن اس کے لیے کیوں کچھ نہیں کرتے۔ آپ کا وقت، بچوں کے رسائل اور کتب ہی بچوں میں ادب کو فروغ دے سکتے ہیں۔

ویسے تو بچوں کے بے شمار میگزین مارکیٹ میں دستیاب ہیں جو بچوں میں ادب کی

تعمیر میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں لیکن میں یہاں حال ہی میں شائع ہونے والا بچوں کا میگزین ماہنامہ 'ساتھی' کا ذکر خاص طور پر کروں گا کہ جنہوں نے اس ماہ 'ابو نمبر' شائع کیا۔ جسے پڑھ کر میں بحیثیت ایک باپ کے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں پاکستان کے بہترین ادیبوں نے اپنی بہترین کاوشوں سے قلم کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ جسے پڑھتے ہوئے کئی بار میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اتنے اچھے میگزین مارکیٹ میں موجود ہونے کے باوجود نا جانے ہم کیوں اب بھی ادب سے محروم ہیں ! ادب کو چھوڑ کر آج ہم بے ادب ہوگئے۔ کیا ہم اپنے بچوں کو ہر ماہ ایک میگزین بھی خرید کر نہیں دے سکتے ؟ معاملہ بچوں کے ادب کا ہے پھر شکایت مت کیجیے گا ! !

# تیری امید تیرا انتظار کرتا ہوں

"وہ آ رہی ہے؟"

نہیں"۔"

"کب گئی تھی؟"

"وہ بتا کر کب جاتی ہے؟ ایسی روٹھ کر گئی ہے کہ اب آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔"

اچھا، جب آ جائے تو بتانا مجھے کام ہے"۔"

سلام نہ دعا ہر وقت اُسی کا پوچھتے ہو، تمہاری بیگم کو پتا چلا تو وہ تو مجھے چھوڑے گی"

نہیں"۔

بیگم تو کب کی چھوڑ کر جا چکی ہے۔ جاتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ جب بجلی آ جائے تو بتا"

"دینا۔ اب اور نہیں جیا جاتا اس گرمی اور اندھیروں میں۔

تم نے اب تک اپنی مدد آپ کے تحت جنریٹر کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟ ہم نئی صدی"
"میں داخل ہوگئے ہیں، یہ دور جنریٹر کا ہے۔
ایک شریف نے کہا تھا کہ 6 مہینے میں لوڈشیڈنگ ختم نہ کردوں تو میرا نام بدل دینا۔"
"بس اس پر یقین کر لیا تھا۔
تم بھی کتنے بھولے ہو، لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کی باتیں تو ہم پچھلے کئی برسوں سے سنتے"
آرہے ہیں۔ یاد نہیں جب راجہ صاحب نے کہا تھا 2009ء تک لوڈ شیڈنگ ختم ہوجائے
"گی۔

"وہ راجہ تھے، یہ شریف ہیں۔"
بس یہی فرق ہے۔ پہلے لوڈ شیڈنگ سب کی برابر ہوتی تھی پاکستان کے معیاری اوقات"
کے مطابق اور عید، بقر عید اور چھٹی پر بجلی بونس میں بغیر تعطل کے ملتی تھی اور اب لوڈ
شیڈنگ علاقوں کو دیکھ کر کی جاتی ہے"۔
اسی لئے اب علاقوں کی زمینوں اور پلاٹوں کی قیمتیں بھی اسی حساب سے طے ہو"

رہی ہیں۔''

''لوگ پہلے مکان خریدنے سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ مکان میں پانی آتا ہے کہ نہیں اب یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بجلی آتی ہے کہ نہیں کیونکہ بجلی کے بغیر تو پانی بھی نہیں آسکتا۔''

''عجیب قانون ہے کہ میں نے بجلی کی ادائیگی بر وقت کی ہے، لیکن اگر میرے پڑوسی نے نہیں کی تو مجھے بھی اس کے ساتھ لوڈ شیڈنگ کا مزا چکھنا پڑے گا۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے؟''

''انصاف چاہیئے تھا تو انصاف کو ووٹ دیتے۔''

''جس نے انصاف کو ووٹ دیا تھا وہاں کون سی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ سنا ہے کہ کچھ علاقے ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی کبھی بجلی ہوا کرتی تھی۔''

''پورے ملک میں ایسے علاقوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جہاں بجلی کے پول دیکھ کر بتایا جاسکتا ہے کہ وہاں کبھی بجلی ہوا کرتی تھی۔''

آثار قدیمہ والوں کو ایسے علاقوں کی کھوج کرنی چاہیئے اور دنیا کے سامنے یہ بات لانی"
" چاہیئے کہ کس طرح آج کے دور میں بھی لوگ بجلی کے بغیر جی رہے ہیں۔
تمہیں یاد ہے پچھلی گرمیوں میں کتنی زیادہ اموات ہوئیں تھیں اسی لوڈشیڈنگ کی وجہ"
"سے۔ مریضوں سے اسپتال بھر گئے تھے۔
اچھا اسی لئے اب انہوں نے جناح اسپتال کی بھی بجلی منقطع کر رکھی ہے تاکہ غریبوں"
"کا اسپتال کا خرچہ بچ سکے۔
"ایسے میں عوام جائے تو جائے کہاں؟"
جانا کہاں ہے، سڑک پر جا کر دھرنا دو، ٹائر جلاؤ اور نعرے لگاؤ۔"
کل بھی بجلی جاتی تھی'
آج بھی بجلی جاتی ہے

”لیکن نعروں سے بجلی پیدا نہیں ہوتی اور ٹائر جلانے سے مزید گرمی میں اضافہ ہوگا۔“
”گرمی لگے گی تو عوام کا تیل نکلے گا، اور عوام کے تیل سے جو بجلی پیدا ہوگی اس سے پھر
کبھی لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی۔“
”ٹھیک کہا اب بجلی پیدا کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں کہ عوام باہر نکلے اور ایوانوں میں
بیٹھے ان پانامہ کے پاجاموں کو فروخت کرکے بجلی پیدا کرے۔“
”خیر ابھی تو میری بجلی آ گئی ہے بعد میں دیکھیں گے۔“
”اللہ حافظ“

# یہ جنگ جاری رہے گی

"مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ "

اچھا ہے تمھیں تو صرف ایک بات سمجھ میں نہیں آتی مجھے تو کوئی بھی بات سمجھ میں"
"نہیں آتی۔

سمجھ میں تو تمھیں تب آئے ناں جب تم کسی کی کوئی بات سنو۔ تم نے تو بس ایک ہی"
"رٹ لگا رکھی ہے کہ میں نہ مانوں۔

"اچھا بتاؤ کیا بات سمجھ میں نہیں آتی؟"

بات اتنی سی ہے کہ امریکہ بہادر طالبان سے مذاکرات بھی کرنا چاہتا ہے اور ان"
"سے لڑائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتا۔

" یہ تو بہت سادہ سی بات ہے جو تمھیں چھوٹی سی عقل میں نہیں آ رہی ۔ "

"تو تمہاری بڑی عقل کیا کہتی ہے اس مسئلہ کے بیچ۔"

بات اتنی سی ہے کہ وہ افغانستان سے نہیں جانا چاہتا۔ وہ اتنی دور سے یہاں چنے "
" بھوننے یا مذاکرات کھیلنے نہیں آیا۔

"تو پھر کیا کرنے آیا ہے؟"

"دہشت گردی کا صفایا کرنا ہے۔"

"لیکن ہمیں یہاں امن لائے بغیر دہشت گردی کا خاتمہ ہوتا تو نظر نہیں آتا۔"

"نہ ہو ہماری بلا سے لیکن ہم یہاں سے جانے والے نہیں تم میری بات لکھ لو۔"

آپ کے ارادے ٹھیک دکھائی نہیں دیتے، لگتا ہے اس کے پیچھے کچھ اور مقاصد بھی"
"ہیں۔
تو اور کیا..... یہ جو نائن الیون کے بعد قتل و خون، ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، خودکش"
"دھماکے اچانک پیدا ہوئے تھے یا کسی کی پیداوار تھے۔
" تو تمہارا مطلب ہے کہ عراق و شام کی جنگ بھی کسی بڑے گیم کا حصہ تھی۔ "
دنیا میں ہر ملک کے اپنے اپنے مفادات ہیں لیکن بڑی طاقتیں اپنے مفادات کے لیے"
چھوٹے ملکوں کو استعمال کرتی ہیں۔ جو ملک ان کے مفادات کے خلاف دکھائی دیتا ہے یہ
"اسے پتھر کے زمانے میں بھیجنے کی دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔
"گویا مفادات کی جنگ نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ "
دنیا تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے لیکن ہم اپنے مفادات کا دفاع دنیا کے ہر کونے تک کریں"
"گے۔
پہلے روس اپنے مفادات کا دفاع کرتے کرتے افغانستان تک آیا تھا اور اب امریکہ"
"بہادر آیا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی کہ افغانستان میں ایسا کیا چیز کاشت ہوتی ہے؟
آپ انگریزوں کو تو بھول ہی گئے وہ بھی یہاں تشریف لائے تھے لیکن پتھر اٹھا کر "
"چھوڑ گئے کہ یہ پتھر بھاری ہے۔
"تو پھر کیا خیال ہے یہ پتھر امریکہ بہادر کب تک اٹھائے گا؟ "

یہ وہ پتھر ہے جو نہ اگلا جا رہا ہے اور نہ ہی نگلا جا رہا ہے۔ واپس جائے گا تو سوویت یونین کی طرح روس بن جائے گا اور غرور خاک میں مل جائے گا اور کھڑا رہے گا تو اس کے اخراجات زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف چین اپنے قدم اس خطے پر مضبوطی سے جما رہا ہے۔ وہ گوادر پورٹ اور راہداری بن جانے کے بعد معاشی طور پر اس قابل ہو جائے گا کہ دنیا میں سپر پاور بن کر ابھرے۔"

"سنا ہے کہ امریکہ جیسی سپر پاور بھی اس کی مقروض ہوتی جا رہی ہے۔"

"مقروض تو یہاں سب ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ کسی نے کشکول اٹھا رکھا ہے تو کسی نے اپنا بینک اکاؤنٹ دے رکھا ہے۔"

"ملا اختر منصور کے بعد اب ملا ہیبت اللہ آئے ہیں جنہوں نے کہہ دیا ہے کہ اب مذاکرات نہیں ہوں گے۔"

".....مطلب یہ جنگ جاری رہے گی"

☆.....☆

# کیوں ایسا ہی ہے ناں ! !

جب دیکھو شکوے، جب دیکھو شکایت۔ یہ اس کی ٹانگ کھینچ رہا ہے تو وہ اس کی ٹانگ کھینچ رہا ہے۔ کوئی ڈگڈگی بجا رہا ہے تو کوئی ناچنے میں مصروف ہے۔ عوام کے اپنے مسائل ہیں اور حکمرانوں کے اپنے الے ترلے۔ ایسے میں ہم جیسے کالم نویس لکھ لکھ کر صفحے کے صفحے کالے کر دیتے ہیں لیکن جن کے دل کالے ہوں ان کو کیا فرق پڑتا ہے ان کے کالے کرتوت تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ایک سانحہ پر ابھی ماتم ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا سانحہ آ لیتا ہے۔ کس سے فریاد کریں اور کس سے منصفی چاہیں کہ یہاں تو مسائل جب تک سڑکوں پر، چوک چوراہوں پر یا دھرنوں تک نہ پہنچیں کسی کے کان میں جوں نہیں رینگتی۔ ایسے میں مایوسی کے بادل فضا کو سوگوار کرتے ہیں۔ بے یقینی کی ہوا چلنے لگتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایک ایسی زور کی رحمت کی بارش ہو کہ یہ سب گندگی اپنے ساتھ بہا کر لے جائے۔ لیکن کیا کریں کہ خواہشات کے چراغوں سے کبھی روشنی نہیں ملتی۔ چراغوں کو اپنے لہو اور پسینے کا ایندھن پلانا ہی پڑتا ہے۔

میں قربانی نہیں دینا چاہتا لیکن قربانی کا بکرا بننے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ آپ مجھے کسی بھی لائن میں لگا لیں۔ آپ چاہے مجھے جوتے ماریں، راستہ بند

کریں، بجلی بند کریں، گیس بند کریں یا پانی بند کردیں لیکن میں ووٹ آپ ہی کو دوں گا۔ میں چیخوں گا چلاؤ گا لیکن ووٹ آپ ہی کو دوں گا۔ آپ راستہ بند کریں گے تو میں فٹ پاتھ پر چڑھ جاؤں گا، آپ بجلی بند کریں میں جنریٹر چلا لوں گا، پانی بند کردیں میں بورنگ کروالوں گا، منرل واٹر گھر پر لگوالوں گا یا ٹینکر ڈلوالوں گا لیکن جناب ووٹ آپ ہی کو دوں گا۔ آپ مہنگائی کرتے جاؤ میں کرپشن کرتا جاؤں گا۔

اب ایسے میں کیا کیا جائے کہ جنہیں لکھنے کی بیماری ہے وہ لکھتے ہی رہتے ہیں لیکن جسے پڑھنا نہ ہو اسے آپ کتنا بھی دیواروں کی دیواریں بھر کر نوشتہ دیوار بنا دیں لیکن سوائے اپنا سر دیواروں پر مارنے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صحرا میں کھڑے ہو کر اگر آپ آواز دیں تو شاید اپنی ہی آواز کی بازگشت واپس آجائے لیکن یہ وہ دنیا ہے جہاں بسنے والے لوگ آواز کو بھی دبا دیتے ہیں کہ انہیں ایسی آوازیں اچھی نہیں لگتیں جو ان کی نیند میں خلل ڈالے یا انہیں بیدار کردے۔ نیند بھی ایسی گہری ہے کہ ان پر زلزلوں پر زلزلے آئیں، سیلاب گزرتے جائیں، ڈرون گرتے جائیں یا پھر کوئی بھی قیامت لیکن یہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر بیٹھے رہیں گے، اس انتظار میں کہ دشمن اسے چھوڑ کر گزر جائے گا۔ لیکن قدرت کا قانون اٹل ہے کہ جس بھیڑیئے نے بھیڑ کو کھانا ہو اسے کسی بہانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھیڑ بھی ایسی جو ہر دشمن کو

اپنا دوست بنائے بیٹھی ہو اور اس سے یہ توقع بھی کہ وہ اسے کچھ نہیں کہے۔

ہماری تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ ہماری فطرت کا حصہ رہا ہے کہ ہم ہر باہر سے آنے والے طاقتور کو سلام کرتے آئے ہیں۔ محمد بن قاسم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہم نے اسے اپنا نجات دہندہ سمجھا اور اسے دیوتا بنا کر اس کا ساتھ دیا۔ ظہیر الدین بابر تشریف لائے تو ہم نے انہیں بھی اپنا نجات دہندہ کہا اور تین سو سال تک ان کا ہاتھ تھامے رکھا۔ پھر انگریزوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم نے انہیں بھی خوش آمدید کہا اور ان کا ساتھ دے کر جاگیریں حاصل کیں۔ پھر امریکہ سپر پاور بن کر ابھرا تو ہم نے اسے بھی اپنا آقا تسلیم کر لیا اور اپنی چادر اور چار دیواری اس کے لیے وا کر دی۔ چین کو دوست بنایا تو ایسا بنایا کہ 'ہر مال چائنا' ہو گیا۔ ہماری صنعتیں تباہ حالی و بربادی کا شکار ہو گئیں لیکن ہم ہمالیہ سے بلند اور سمندروں سے گہری دوستی نبھاتے رہے۔ آج ہمیں پھر کسی ایسے ہی نجات دہندہ کی تلاش ہے جو آ کر ہم پر حکومت کرے کیونکہ ہمیں تو بس نوکری کرنی ہے چاہے وہ وڈیرے کی ہو، چوہدری کی ہو یا کسی بھی سرمایہ دار کی ہو۔ ہم اسی میں خوش ہیں کہ ہمیں روٹی مل رہی ہے چاہے وہ کسی خوبصورت پنجرہ میں ملے یا گلے میں غلامی کے پٹے کی صورت میں ملے لیکن ہمیں روٹی ملنی چاہیے۔ کیوں ایسا ہی ہے ناں.....!!

☆.....☆

## ......لگ جا بیٹا لائن میں

''ہمارے یہاں عقلمندوں کی کمی نہیں، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔''

''جب ہزار ملتے ہیں تو پھر ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اسی لیے ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کی جاتی بلکہ جو مل جائے اسی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔''

''ایسا کیا ہوگیا، کچھ بتاؤگے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہوگے؟''

''اب دیکھو ناں ہمارے ملک میں جو عقلمند ملتے ہیں وہ عوام کے خادم نہیں بلکہ عوام کے حاکم ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ عقلمندی کے ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ جس سے عوام کے چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔''

''ایسا کیا ہوگیا جو تم ایسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو؟''

''وارداتیں ہورہی ہیں یا ہونے کا خطرہ ہے تو ڈبل سواری پر پابندی لگادو۔ موبائل سے ریکی کی جاتی ہے تو موبائل کا نیٹ ورک بند کردو۔ بجلی کی ادائیگی کسی علاقے میں کم ہورہی ہے تو وہاں پر لوڈشیڈنگ کرو۔ آٹا مہنگا ہے تو ڈبل روٹی کھالو۔''

''واقعی یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی۔ لیکن اصل بات کیا ہے تم وہ کرو۔ یہ پرانی باتیں ہیں۔''

عوام کے نصیب میں دربدر کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ کبھی یوٹیلٹی بلوں کے لیے لائن" میں لگایا جاتا تھا، کہیں گیس بھروانے کی لائن میں لگایا گیا، کہیں پیٹرول نایاب کرکے لائن میں لگا یا گیا، کہیں سم رجسٹریشن کے نام پر لائن میں لگایا گیا، کہیں ووٹ ڈالنے کے لیے لائن میں لگایا، کئی لائسنس کے لیے لائن میں لگایا اور کہیں شناختی کارڈ کے حصول "کے لیے نادرا کی لائن میں لگایا۔

جو قوم لائن پر نہیں آتی پھر اسے اسی طرح لائن میں لگایا جاتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ابھی" "کون سی لائن لگنے والی ہے؟

"سنا ہے چھ ماہ میں شناختی کارڈ کی دوبارہ تصدیق ہوگی۔"

"ٹھیک سنا ہے۔"

"مطلب ایک بار پھر دوبارہ سے لائن میں لگ کر تصدیق کرنی ہوگی؟"

اب تک تو آپ کو لائن میں لگنے کی عادت ہوجانی چاہیے تھی۔ لیکن چونکہ یہ قوم "
"لائن میں لگنے کی عادی نہیں اس لیے یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے۔

اب آپ کیا چاہتے ہو بغیر لائن کے تمہارا کام ہوجائے؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ"
زرداری کی بیٹے بلاول تو نہیں ہیں یا آپ شریف خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے جو آپ
"بغیر لائن میں لگے اپنا کام کروا سکیں۔

تو پھر ایک کام کیوں نہیں کرتے۔ سب کو لائن میں لگا کر چار چار جوتے کیوں نہیں"
"لگائے جاتے تاکہ سب کی عقل ٹھکانے آجائے

''ایسی ذلت بھلا کون پسند کرے گا؟''

ذلت عوام کا مقدر ہے کیونکہ ان کے پاس شعور نہیں۔ انہوں نے اس کو اپنا نصیب '' سمجھ لیا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ عقلمند ہم پر کیوں حکومت کر رہے ہیں جو ہمارے ووٹ لے کر آتے ہیں اور ہمارے ہی پیسوں پر پلتے ہیں اور ہمارے درمیان اس طرح وی آئی پی انداز میں نکلتے ہیں جیسے یہ انسان ہیں اور ہم سب گدھے۔ان کی جان کی ''قیمت ہے اور ہم چیونٹیاں ہیں جس کے چاہے پاؤں تلے روندھے جائیں۔

''تو تمہارے خیال میں عوام کیا کر سکتی ہے؟''

کہہ تو رہا ہوں چار جوتے سب کو لگائے جائیں کیونکہ سب کو جلدی ہے۔ کسی کے '' پاس ان حکمرانوں سے پوچھنے کا وقت نہیں کہ یہ سب ہمارے لیے ہی کیوں ہے .....کیا ''حکمران بھی اس لائن میں لگتے ہیں؟

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....آج تو تم لیڈروں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ کہیں الیکشن'' ''لڑنے کا پروگرام تو نہیں؟

''شناختی کارڈ کی تصدیق تو ضروری ہے یہ ملکی سالمیت کا معاملہ ہے۔''

جن لوگوں نے جعلی شناختی کارڈ تصدیق کرکے بنوا لیے ہیں کیا وہ دوبارہ تصدیق نہیں '' کروا سکتے۔ بجائے نظام ٹھیک کرنے کے آپ نظام الدین کو ٹھیک کرنے میں لگے ہیں ''بھلا اس طرح بھی کچھ حاصل ہوگا؟

جب تک یہ عقلمند موجود ہیں یہ نظام کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا، یہ بات نظام ''

”.....الدین کو سمجھنی ہوگی ورنہ

”.....ورنہ لگ جا بیٹا لائن میں“

☆.....☆

# کیا وزیر اعظم صاحب کو ہوش آگیا؟

"سنا ہے وزیر اعظم صاحب کو ہوش آگیا ہے؟"

"نہ صرف ہوش آگیا ہے بلکہ وہ اب گھر بھی لوٹ آئے ہیں؟ "

"وزیر اعظم صاحب کو تو ہوش آگیا، قوم کو کب ہوش آئے گا؟"

وزیر اعظم صاحب نے تو باہر سے آپریشن کروایا تھا قوم کا بھی آپریشن کروانا پڑے گا۔"

"

"آپریشن ضرب عضب ہوا تو ہے۔"

"لیکن یہ آپریشن پاکستانی کر رہے ہیں، میرا اشارہ غیر ملکی آپریشن کی طرف ہے۔ "

"یہ تم اشارے مت کیا کرو، مجھے اشارے سمجھ میں نہیں آتے۔ "

"یہی تو مسئلہ ہے اشاروں کے بغیر ملک نہیں چل سکتا۔ "

"وہ کیسے؟"

سیدھی سی بات ہے سرخ بتی پر رکنا ہے اور سبز بتی پر نکلنا ہے۔ یہ اشارے ہمارے"

"لیے ہی تو ہیں۔

"مجھے ابھی اشارے نہیں سمجھنے ۔۔۔ رمضان آگیا ہے۔ "

" وہ تو میرے پاس بھی باقاعدگی سے آتا ہے راشن پانی دے کر رخصت کرو۔ "

"وہ راشن پانی لینے نہیں آیا ہمیں جگانے آیا ہے۔ "

”رمضان کا کام ہی یہی ہے۔۔۔ چوکیدار جو ہوا ہمارے محلّہ کا۔“
”میں چوکیدار رمضان کی بات نہیں کر رہا میں ماہ رمضان کی بات کر رہا ہوں۔ “
”تو کھل کر کہو ناں یہ اشاروں میں تم نے بھی بات شروع کر دی۔ “
”میں نے تو کوئی اشارہ نہیں کیا، تم خود ہی مطلب غلط لے لیتے ہو۔ “
”مطلب کی بات کرو، ماہ رمضان آگیا ہے تو اب کیا ہونا چاہیے؟ “
کچھ نہیں ہونا چاہیے ۔۔۔ صرف لوڈشیڈنگ کا دورانیہ کم ہونا چاہیے یا پھر کم از کم “
سحر و افطار اور تراویح میں لوڈشیڈنگ نہیں ہونی چاہیے۔ اتنا احترام تو زرداری نے بھی
”کیا تھا، یہ تو پھر خاندانی شریف ہیں۔
”وزیر اعظم صاحب ملک میں نہیں ورنہ وہ ضرور اس بات کا سختی سے نوٹس لیتے۔ “
ان کے نوٹس سے ہی ملک چل رہا ہے، اللہ ان کو لمبی عمر دے، اگر یہ نہیں ہوں گے تو “
”کیا ملک نہیں چلے گا۔
” یہ بات قوم جانتی ہے اسی لیے وہ ان کو ہی ووٹ دیتی ہے۔ “
لیکن اس سے پہلے کتنے لوگ اس دنیا سے چلے گئے جن کا یہ خیال تھا کہ ان کے بغیر یہ “
”دنیا نہیں چل سکتی۔
یہ بات قوم ماننے کو تیار نہیں۔ تم بس مسجد میں جا کر اللہ اللہ کرو، ہمیں اپنا کام کرنے“
”دو۔
تو مسجد میں جب اللہ پوچھے گا کہ تم سود لیتے ہو، میرے خلاف جنگ کرتے ہو “

''تو میں کیا جواب دوں گا؟

کہہ دینا میں تو سود نہیں لینا چاہتا لیکن شریف صاحب نے کہا تھا کہ اس کے بغیر ملک ''
''نہیں چل سکتا۔

''اچھا اگر اللہ نے پوچھ لیا کہ تم میرے بندہ ہو یا شریف کے؟ تو بولو پھر کیا جواب ہوگا؟''
''سیاسی باتیں مت کرو، مسجد میں جا کر بس اللہ اللہ کرو، اللہ کچھ نہیں پوچھے گا۔ ''
ٹھیک کہا، اللہ واقعی نہیں پوچھے گا۔ شریف کے بغیر ملک نہیں چل سکتا، سود کے ''
''بغیر ملک نہیں چل سکتا تو پھر کیا اسلام کے بغیر ملک چل سکتا ہے؟
''دیکھ نہیں رہے اتنے سالوں سے چل تو رہا ہے۔''
ٹھیک کہا، بالکل اسی طرح جیسے بغیر وضو کے نماز ہو جاتی ہے۔ اگر یقین نہیں تو پڑھ کے ''
دیکھ لو۔'' چ

# حکومت، دھرنا ڈھرن

"بڑے موقع پر تشریف لائے۔"

"موقع کی تلاش میں تو ہے ہم ہر وقت رہتے ہیں لیکن آپ گھاس ہی نہیں ڈالتے۔ "

خیر ایسی بات بھی نہیں گھاس تو گھوڑے کے لیے ہوتی ہے، اور آپ کو ڈالنے کے "

"لیے تو اور بھی بہت کچھ ہے میرا مطلب ہے خاطر تواضع کے لیے۔

"کام کی بات کرو، ہم غریبوں کو کیسے یاد کیا؟ "

" کینیڈا سے تشریف لا رہے ہیں اور غریبوں کی بات کرتے ہیں۔ "

"اب میرا منہ مت کھلوائیں آپ بھی تو لندن سے علاج کرواتے ہیں۔"

" اچھا غصہ جانے دیں ..... یہ بتائیں کیسے آنا ہوا؟ "

آپ کہتے ہیں غصہ جانے دیں۔ غضب خدا کا چودہ لوگوں کو دن دیہاڑے موت کی "

"نیند سلا دیا گیا اور آج تک کسی بھی ذمہ دار کا تعین نہ کیا جا سکا۔

آپ کو پتا بھی ہے کہ حکومت میں کوئی بھی ذمہ دار نہیں ..... اگر ہوتا تو حکومت "

لندن سے نہ چلائی جاتی۔ یہ لندن والوں کے ہم پر احسانات ہیں کہ اپوزیشن بھی وہیں

" سے کنٹرول ہوتی ہے اور حکومت بھی۔

" ہم ایسا ہر گز نہیں ہونے دیں گے۔ اسی لیے تو ہم کینیڈا سے تشریف لائے ہیں۔"

"آپ دھرنا دے کر دیکھ چکے ہیں..... اس سے حکومت نہیں جانے والی۔"

بغیر دھرنے کے آپ کا بھی کھایا پیا ہضم نہیں ہونے دیں گے۔ غضب خدا کا جب تک ''
'' دھرنا نہ دو آپ کے کانوں میں جوں ہی نہیں رینگتی۔
حکومت میں 'جوں' ہوگی تو رینگے گی ناں۔ آپ کو تو حکومت میں خواہ مخواہ جوئیں ''
'' نکالنے کی عادت پڑ گئی ہے۔
عید تک مہلت ہے ہوش کے ناخن لو۔ شکر کرو ابھی عید میٹھی ہے بقر عید ہوتی تو کئی ''
''ایک کی قربانی ہو جاتی۔
''دیکھو حکومت جھکنے کے لیے تیار ہے لیکن سجدہ نہیں کر سکتی۔''
''ٹھیک کہتے ہیں سجدہ تو آپ نے کسی اور کے آگے کرنا ہوتا ہے۔''
''دیکھیں حکومت کی ٹانگیں کھینچنا بند کریں۔ ترقی کا پہیہ چلنے دیں۔''
آپ بھی ٹانگیں مارنا بند کریں۔ ترقی کا پہیہ اگر پانامہ جائے گا تو ہم اسے نہیں چلنے ''
'' دیں گے۔
''آپ کچھ بھی کرلیں اس بار حکومت نہیں جائے گی۔''
حکومت ہے کہاں جو جائے گی۔ چھوٹا چوری کرے تو اس کو عوام مار مار کر بھرکس ''
نکال دیتے ہیں اور کوئی بڑا چوری کرے تو اس کو نہ صرف وی آئی پی پروٹوکول میں
''عدالت لایا جاتا ہے بلکہ اس کو ووٹ بھی دیا جاتا ہے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے؟
حاجیوں کے پیسے کھانے والے حکومت سے حساب مانگتے ہیں۔ اپنا کالا چشمہ اتاریں اور ''
صوبے پر توجہ دیں۔ انہیں خیبر پختونخواہ کی تقدیر بدلنے سے کسی نے

”نہیں روکا جہاں چوہے اور پولیو ہے۔
فکر نہ کریں یہ سال ملک کو کھانے والے چوہوں اور پولیو زدہ لوگوں سے آزادی کا“
”سال ہوگا۔
چلیں دیکھتے ہیں ..... ! ! دھرنے کا دھڑن ہوتا ہے یا حکومت کا۔پہلے بھی دیکھا ہے اب“
”بھی دیکھ لیں گے۔

☆.....☆

# یزید نے رمضان کو بھی محرم بنادیا

''ایک بوتل پانی کی لے آؤ۔''

''خدا کا خوف کرو، روزے میں پانی مانگتے ہو۔''

''روزہ ہے تو کیا پانی سے روزہ نہ کھولو؟''

''لیکن ابھی تو افطار میں کافی وقت ہے۔ ''

''وقت تو محرم میں بھی ابھی کافی ہے لیکن یزید نے رمضان کو بھی محرم بنا دیا ہے۔ ''

''کیا مطلب ؟ ''

''پانی کی بوند بوند کو ترس گئے ہیں۔ لیکن مجال ہے کسی پر کوئی اثر ہوا ہو۔ ''

اثر کیسے ہو جب پانی بھی بکنے لگے اور پانی کا روبار بن جائے تو سبیل لگانا صرف رسم ''

''رہ جاتا ہے۔

حسینؓ کے نام لیوا تو بہت ہیں چاہے وہ سنی ہو یا شیعہ سب ہی ان کے نام کا دم بھرتے''

ہیں۔ لیکن مجال ہے جو ان کی سنت پر کوئی عمل کرے اور اس یزیدیت کے خلاف کلمہ

''حق بلند کرے۔

'' مجھے تو تمہاری یہ بات پانی پانی کر گئی ہے لیکن کیا کروں پانی ادھر بھی نہیں آ رہا۔ ''

''پانی تو نہیں آ رہا ہوگا لیکن پانی کا بل تو آ رہا ہے ناں باقاعدگی سے۔ ''

"ہاں ہاں وہ تو ہمیں جمع کروانا ہے چاہے پانی آئے یا نہ آئے۔ "
میں نے تو پانی کا بل ہی جمع کروانا چھوڑ دیا ہے، جب پانی نہیں ملتا تو بل کیوں دیں؟ "
"

"لیکن اس کے باوجود بل باقاعدگی سے آ رہا ہوگا۔ "
"جی ہاں اور نوٹس پر نوٹس بھی کہ پانی کاٹ دیں گے۔ "
مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی کے پاس پینے تک کو پانی نہیں اور کسی کے "
"پاس اتنا پانی ہے کہ باہر ندی بہانے میں مصروف ہے۔
اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔ بدانتظامی جب عروج پر پہنچ جائے "
"تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔
پانی کی لائنیں اتنی پرانی اور خستہ حال ہیں کہ ان کو تبدیل کرنے کے لیے حکومت کو "
"تبدیل کرنا پڑے گا۔
"وہ تو ممکن نظر نہیں آتا۔ "
تو پھر ڈالے جاؤ پانی کے ٹینکر یا پھر بورنگ کا پانی اور فلٹر پلانٹ کی منرل واٹر کی "
بوتلیں۔خدا بھی ایسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جسے اپنے حالات کو بدلنے کا خیال نہ ہو۔
"

"پانی کے نام پر سیاست ہو رہی ہے لیکن عوام پانی پانی کو ترس گئے ہیں۔"
جسے دیکھو پانی کی بوتلیں اٹھائے پانی کی تلاش میں نکلا دکھائی دیتا ہے۔یا پھر پانی سے "
"بھری بوتلیں گھروں پر سپلائی ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

چلتا ہوں روزہ افطار کا وقت قریب آ رہا ہے، سوچا تھا کہ تمہارے گھر پانی آ رہا ہوگا"
لیکن تم بھی میری طرح نکلے ۔ اب مجھے پانی لے کر گھر جانا ہے تاکہ روزہ کھول سکیں۔
"

"رکو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں، مجھے بھی روزہ کھولنا ہے۔ "

☆.....☆